اِقبال

بارگاہِ عصمت و طہارت میں



خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

محمد اقبال

تالیف: سید تمہید حسنین رضوی

ادارۂ نشرِ دانش، نیوجرسی، امریکا

اقبال
بارگاہِ عِصمَت وطہارت میں

تشریح، توضیح، تحقیق

سیّد تلمیذ حسنین رضوی

شناختِ کتاب

نامِ کتاب:............... اقبال بارگاہِ عصمت وطہارت میں

تشریح، توضیح، تحقیق:............... مولانا سید تمیز حسنین رضوی

کمپوزنگ:............... احمد گرافکس، کراچی

سرورق:............... سید باقر مہدی رضوی

طبع اوّل:............... ۲۰۱۸ء

طباعت:............... اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی

ناشر:............... ادارۂ نشرِ دانش، نیو جرسی، امریکا

ملنے کا پتا:............... محفوظ بک ایجنسی، مارٹن روڈ، کراچی

ہدیہ:............... ۵۰۰ روپے

انتساب

والدِ گرامی حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سیّد اظہار الحسنین رضوی
کے نام
جن کے فیضِ تربیت نے اس منزل تک پہنچایا
اور
والدۂ ماجدہ نجمہ خاتون
کے نام
جن کی دعائیں اور نیک تمنائیں
ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ ہیں

سیّد تلمیذ حسنین رضوی

فہرست

اظہارِ تشکر

الحمدللہ والمنۃ کتاب ھذا ''اقبال بارگاہِ عصمت و طہارت میں'' طباعت کے مراحل طے کر کے اشاعت کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ ہم نے اس کے صوری و معنوی حسن پر کافی توجہ مبذول کی ہے۔ امید واثق ہے کہ ہماری یہ کوشش بارگاہِ رب العزت میں قبول اور عامۃ الناس میں مقبول ہو گی۔

اس کتاب کی پروف ریڈنگ میرے علاوہ برادرم نصرت علی نقوی اور عزیزم علامہ ارتضٰی عباس نقوی نے کی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم ہمیں مطلع کر کے شکریے کا موقع فراہم کریں۔ ہم آپ کے مشوروں اور تجاویز کا بھی خیر مقدم کریں گے۔

اس کتاب کی تزئین و آرائش کے لیے میرے دونوں بیٹوں ندیم افتخار رضوی اور مولانا رضوان ارسلان رضوی نے شبانہ روز محنت کی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطا کرے۔

میرے عزیز دوست مشفق و مہربان شاعرِ شہیر، شاعرِ اہلبیت عالی جناب محترم المقام سخاوت حسین شہاب کاظمی جرولی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنا کافی قیمتی وقت صرف کر کے پوری کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور قطع و برید اور اضافات و زحافات کے بعد اسے قابلِ اشاعت بنایا۔ نیز ''صاحبِ کتاب، اقبال اور کتاب'' کے عنوان سے نہایت مبسوط، پُر مغز اور معلومات سے پُر مضمون تحریر فرمایا جو اقبال شناسی کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے کتاب کا مقدمہ سمجھا جائے یا اُسے تقریظ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ہم صمیمِ قلب اور دل کی گہرائیوں سے اپنے جملہ احباب و اصدقا جو اس کتاب کی اشاعت کے متمنی اور خواہاں تھے، بالخصوص درج ذیل مخلصین اور محبین کے شکر گزار ہیں۔

ڈاکٹر شہلا نقوی، ڈاکٹر برکت جعفری، ڈاکٹر آفتاب حسین، ڈاکٹر اقبال جعفری، ڈاکٹر

اسد صادق، ڈاکٹر ہاشم رضا، ڈاکٹر سجاد اصغر، ڈاکٹر مجتبیٰ سرور، ڈاکٹر مختار حسین، ڈاکٹر حسن عباس، ڈاکٹر وجیہہ رضوی، جناب نشید انور، جناب نثار علی شاہ اور جناب محمود جعفری۔ جزاہم اللہ عنی خیر الجزاء، واحسن الجزاء۔

فقط والسلام

سید تمیز حسنین رضوی

حرفِ آغاز

علامہ اقبال مشہور شاعر، ادیب، قانون داں، سیاست مدار، صوفی صافی عارف باللہ، فلسفی اور مفکر گزرے ہیں۔ جس ہستی میں یہ تمام صفات جمع ہوں اس کا تعارف آسان نہیں بلکہ بہت دشوار ہے۔

وہ خود فرماتے ہیں۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

ایسے نادر الوجود اور فقید المثال افراد روز روز جنم نہیں لیتے پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے ایسے افراد جلوہ دکھاتے ہیں اور اپنے کارہائے نمایاں سے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت واستعجاب میں ڈال دیتے ہیں۔

علامہ اقبال کا دور مسلمانوں کے انحطاط کا دور تھا مسلم معاشرہ رو بہ زوال تھا اور ملت مسلمہ قعر مذلت میں گرگئی تھی۔ اُمت کا شیرازہ بکھر چکا تھا کوئی راہنما اور لیڈر ایسا نہ تھا جو اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچاتا اور اسے ساحل مراد تک پہنچا دیتا۔ ایسے عالم میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنے زندہ پائندہ اور تابندہ اشعار کے ذریعے ملت خوابیدہ کو بیدار کیا، انھیں خواب غفلت سے جگایا ان میں حرّیت وآزادگی کی روح پھونکی انھیں ان کی گم شدہ تہذیب، تمدن اور وراثت سے آگاہ کیا انھیں یہ سمجھایا کہ ہم کس طرح ترقی کی راہ پر گام زن ہو سکتے ہیں اور اقوام عالم میں اپنا حقیقی مقام پا سکتے ہیں۔ انھوں نے رنگ، نسل، خاندان اور نژاد کے بتوں کو توڑا اور جو اسلام کی حقیقی تعلیمات تھیں ان سے ملت کو آشنا کیا۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

انھوں نے خانقاہی نظام کی مخالفت کی اور یہ فرمایا

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

(ارمغانِ حجاز)

علامہ اقبال نے قرآن حکیم کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا انھوں نے تعلیمات قرآنی کو اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے، ان کے اشعار کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے افکار اور نظریات کا منبع اور سرچشمہ کتابِ الٰہی ہے وہ فرماتے ہیں:

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمین

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے عاشق تھے وہ فرماتے ہیں:

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

دوسری جگہ فرمایا

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت، الفت اور چاہت کے ساتھ ساتھ حضرت علی علیہ السلام سے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

علامہ اقبال سیدھے سادے اور سچے مسلم تھے وہ شیعہ یا سنی کی تفریق کے قائل نہ

تھے۔ اہل بیت علیہم السلام سے محبت کرتے تھے ان کے نزدیک جو ہستیاں محترم تھیں ان میں حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام سب سے نمایاں ہیں۔

انھوں نے واقعات کربلا بالخصوص امام حسین علیہ السلام کا نہایت عقیدت اور محبت سے ذکر کیا ہے۔ وہ امام حسینؑ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

درمیان اُمت آں کیواں جناب
ہمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب

☆☆☆

(مثنوی اسرار و رموز کا تعارف)

میرے پاس اسرار خودی و رموز بے خودی دونوں یکجا صورت میں عبدالمجید خوش نویس کی تحریر میں شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور کی مطبوعہ ہے جس میں صفحات کی تعداد ۱۹۹ ہے۔

شروع میں دیباچہ ہے جس میں یہ تحریر ہے۔

"اس ایڈیشن میں ناظرین کی سہولت کے لیے دونوں مثنویاں یعنی اسرار خودی اور رموز بے خودی یکجا شائع کی جاتی ہیں معمولی لفظی ترمیم کے علاوہ مطالب کی مزید تشریح کے لیے بعض جگہ اشعار کا بھی اضافہ ہے جن کی مجموعی تعداد سو سوا سو ہوگی۔ ایک دو جگہ نئے عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں۔ مگر کتاب کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں۔"

کتاب میں سن اشاعت نہیں ہے۔

(محمد اقبال کا نام تحریر ہے)

پہلا حصہ اسرار خودی ہے اور اس کی ایک نظم شرح اسمائے مرتضیٰ ہماری اس کتاب کی زینت ہے جس میں اشعار کی تعداد ۳۴ ہے۔

بقول فرماں فتح پوری "اسرار خودی ہیئت اور مضمون کے لحاظ سے ایک طویل نظم ہے اور ۱۹۱۵ء میں پہلی بار زیر اہتمام حکیم فقیر محمد چشتی لاہور سے شائع ہوئی مستقل کتاب کی صورت میں یہ ان (اقبال) کی پہلی مطبوعہ تخلیق یا تصنیف ہے۔ اسرار خودی کا موضوع خودی ہے۔ بنیادی طور پر یہی تصنیف اقبال کے فکروفن کا رُخ متعین کرتی ہے اور اسی کی بدولت وہ ایک چونکا دینے والی شاعری کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آتے ہیں۔ اسرار خودی کی بحر وہی ہے جو مثنوی مولانا کے روم کی ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اسرار خودی مولانا روم اور ان کی مثنوی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے"۔ علامہ اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ انھیں پیرِ رومی سے نسبت روحانی ہے۔

(اقبال سب کے لیے فرمان فتح پوری ص ۲۰۴۔ ۲۰۳)

علامہ اقبال کا یہ شعر اس بات پر شاہد ہے۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

(رموزِ بے خودی)

یہ مثنوی دراصل اسرار خودی کا تتمہ ہے اسے بحر رمل مسدس مقصور فاعلاتن فاعلاتن فاعلات یعنی مولانا روم کی مثنوی کے وزن پر لکھا گیا ہے اس میں سے ہم نے دو نظمیں اپنی کتاب کی زینت بنائی ہیں۔

<u>در معنی حریت اسلامیہ وسرِّ حادثۂ کربلا</u>

اس مفہوم میں کہ اسلامی آزادی کیا ہے؟ اور واقعۂ کربلا میں کون سا راز پنہاں ہے؟

اس نظم میں اشعار کی تعداد ۳۹ ہے۔

رموز بے خودی کی دوسری نظم جسے ہم نے اس کتاب کے لیے منتخب کیا ہے اس کا نام ہے۔

در معنی این کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا"

اسوۂ کاملہ ایست برائے نساء اسلام

اس مفہوم میں کہ عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

اسلام کی خواتین کے لیے مکمل نمونۂ عمل ہیں۔

اس نظم میں اشعار کی تعداد ۱۹ ہے۔

اور یہ علامہ اقبال کی بہت ہی شاہ کار نظم ہے جو اس موضوع پر تحریر کی گئی ہے۔

اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق اشعار کی تشریح ہے جن کی تعداد ۲۶ ہے۔

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے فقر، عشق، ابوتراب اور کرّار کے بارے میں جن نظریات کا اظہار کیا ہے ان کی توضیح کی گئی ہے۔

اس کتاب میں علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم "سپاس جناب امیر" کے عنوان سے بھی جزو کتاب ہے جس میں ۳۴ اشعار ہیں جسے سرود رفتہ میں غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری نے رسالۂ مخزن بابت جنوری ۱۹۰۵ء سے نقل کیا ہے اس نظم کے آخری ۱۳ اشعار علامہ اقبال کے شعری مجموعے پیام مشرق میں موجود ہیں اور وہ جس نظم سے ماخوذ ہیں اس کا عنوان "عشق" ہے اس کتاب میں اصحاب رسول حضرت سلمان فارسی حضرت ابوذر غفاری اور موذن رسول حضرت بلال ؓ کا بھی ذکر ہے۔ نیز امیر المومنین علیہ السلام کے خادم خاص حضرت قنبر کا خصوصی تذکرہ ہے۔

آخر کتاب میں "امام" اور "امامت" کے بارے میں سیر حاصل بحث ہے۔

اس موضوع پر میری کتاب سے قبل دو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔

۱۔ اقبال اور حب اہلبیت اطہار جسے تحریر کیا ہے جناب سید محبوب علی زیدی الواسطی نے

۲۔ اقبال در مدح محمد و آل محمد جو تالیف ہے سید احسن عمرانی کی

اب آپ کی خدمت میں "اقبال بارگاہ عصمت وطہارت میں" کے عنوان سے یہ کتاب پیش کی جارہی ہے۔ خداوند عالم بارگاہ معصومین میں میری اس خدمت کو قبول فرمائے۔ اور قارئین کرام تک میری گذارشات پہنچائے۔

والسلام

تلمیذ حسنین رضوی

نیو جرسی۔ امریکہ

صاحبِ کتاب، اقبال اور کتاب

از شباب کاظمی

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

مختلف کتاب ھذا جناب سید تمیز حسنین صاحب رضوی نے حافظ شیرازی کا یہ شعر کسی شعر کی تشریح میں کسی جگہ نقل کیا ہے اور جن معنوں میں نقل کیا ہے وہی اس کا محل ہے مگر ہم نے دیوانگی میں اسے اپنی گفتگو کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس کتاب پر کچھ لکھنا ایسا ہی بارِ امانت ہے جس کا اٹھانا ہم جیسے ہیچ مداں، کندۂ ناتراش کے لیے معذرت کر لینے کا محل تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ موصوف کے حلقۂ ارادت میں برِ صغیر کے کتنے ہی صاحبِ قلم اور صاحبانِ علم اور جید علمائے کرام ہیں جو اس کتاب پر کچھ لکھنے کے مجاز بھی تھے اور مستحق بھی اگر موصوف ان میں سے کسی سے بھی کہتے تو وہ بسر وچشم لکھنے کے لیے تیار ہو جاتے اور ان کی تحریر سے مزین ہو کر یہ کتاب اور بھی مؤثر ہو جاتی۔ قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند والا مصرعہ ان کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی۔

جن دنوں ہم وزارتِ مذہبی امور واوقاف (سندھ) میں وزیرِ مذہبی امور واوقاف حافظ محمد تقی (جن کو مرحوم کہنے سے شہید کہنا زیادہ موزوں ہے) کے پرائیوٹ سیکریٹری تھے تو حیدرآباد سندھ کے دورے میں ہماری ان سے پہلی ملاقات حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید شمر حسن صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کے ساتھ ہوئی جو سندھ کے بہت بڑے عالم اور مدرسہ مشارع العلوم کے بانی تھے۔ موصوف یعنی تمیز حسنین رضوی مولانا محمد علی جوہر کے انداز کی شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس، نہایت دلکش، بھاری بھرکم رکھ رکھاؤ والی شخصیت میں دل کو بھا گئے۔ موصوف ان دنوں کسی تعلیمی ادارے سے منسلک تھے استادانہ نپی تلی گفتگو نے ہمیں اور ہمارے وزیر کو بھی خاصہ متاثر کیا۔ پھر شاید ایک بار پھر حیدرآباد کے دورے میں قدم شریف کے مقام پر

ملاقات ہوئی اور بس۔۔۔ پھر ہوا یہ کہ کچھ ناگزیر حالات نے ہمیں ترک وطن پر مجبور کر دیا اور ہم سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر نیوجرسی، امریکہ آگئے ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ہم جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں دوسری منزل پر مقیم ہیں وہاں ایک دن پہلی منزل پر موصوف بھی اٹھ آئیں گے۔ موصوف ان دنوں اکیلے تھے اور ہم مع خاندان کے بس پھر کیا تھا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

خوب خوب ملاقاتیں ہونے لگیں۔ قربتیں گیسو دراز ہوتی گئیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے کا خوب خوب موقع ملا ہم ان کے علم و فضل کے گرویدہ ہوتے گئے۔ یہ ہماری شاعری کو سراہنے لگے۔ کچھ ماہ بعد ان کے اہل خانہ بھی آگئے تو یہ تعلق خاطر قرابتداری کی صورت اختیار کر گئی۔ اس اکل کھرے امریکہ میں جہاں ہمسایہ، ہمسائے کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتا "اگر نام کی تختی مکان پر نہ لگی ہو تو"۔ ہمارے لیے ان کا وجود خوش بختی کی علامت بن گیا۔ پھر چند سال بعد ہم نے مکان خرید لیا، موصوف بھی وہاں سے چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو گئے۔ ہر چند کہ مسافتیں بڑھ گئیں مگر دلوں کی قربت کم نہ ہوئی۔ آج کل ہم مشی گن اسٹیٹ میں ہیں مگر تعلق خاطر الحمدللہ پہلے کی طرح برقرار ہے۔ اگرچہ موصوف دینی علوم پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ ایم اے اردو، فارسی اور عربی ہیں اور ہم صرف ایم اے اردو ادب مگر موصوف نے کبھی اپنی لیاقت کا رعب ہم پر نہیں جمایا۔ اس طرح ہمسائے سے قرابت داری اور دوستی کی یہ مدت تقریباً تین دہائیوں پر محیط ہے۔ حضرت موصوف کو بیکار بیٹھنے کی عادت نہیں مجالس وغیرہ سے جب فرصت ملتی ہے تو تالیف، تصنیف و ترجمہ میں مصروف ہو جاتے ہیں، درجنوں کتابیں آپ کی تالیف ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ حال ہی میں آپ نے کلام ربانی کا اردو ترجمہ فرمایا ہے جس میں عمومی ترجموں میں جو عبارتیں قوسین میں لکھی ملتی ہیں ان سے گریز کرتے ہوئے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک نادر کام ہے جو شاید ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ اتنی مصروف زندگی میں

بھی تربیت اولاد سے غافل نہیں رہے۔ ان کے ایک فرزند مولانا سید رضوان ارسلان رضوی سلمہٗ نیوجرسی کے ایک بڑے ادارے MFI مسجدِ علی میں Resident Alim ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

صاحبو یہ تو تھا مولانائے موصوف کا سرسری سا تعارف اور شاید اس بہانے سے ہمارے تعلقِ خاطر کی بات جو قلمبند ہونے کے بعد محفوظ رہ جائے گی۔ اس میں ان کا کوئی فائدہ ہو نہ ہو راقم الحروف کا فائدہ ضرور ہے۔

ہمارے اسکول کے زمانے سے ام اے اردو ادب کرنے تک شعری ادب میں علامہ اقبال کی شاعری ہمارے لیے مرکزِ نگاہ رہی ایک زمانے تک علامہ صاحب کی نظمیں اور اشعار خاصی تعداد میں یاد بھی تھے۔ بچھ اب بھی یاد ہیں۔ ابتداً ہم صرف غزل گوئی کی طرف مائل تھے لیکن ام اے کرنے کے بعد یعنی ۱۹۷۳ء سے ہمارا رجحان مذہبی شاعری کی طرف ہوگیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غزل گوئی ترک ہوگئی مگر مذہبی رجحان نے اور انیس و دبیر جیسے نابغۂ روزگار شعرا کے مطالعے نے ہماری ذہنی تربیت کرکے ہمیں مرثیہ نگاری کی طرف متوجہ کر دیا۔ اقبال کے ساتھ ساتھ ہم نے دیگر اساتذہ، میرؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ، ناسخؔ، داغؔ، آتشؔ، مومنؔ، غالبؔ وغیرہ کو ہمیشہ اپنے مطالعے میں رکھا۔ مگر غزل گوئی میں غالبؔ اور مذہبی شاعری میں انیسؔ سے جو لگاؤ پیدا ہوا وہ کسی اور سے پیدا نہ ہوسکا۔ ان کے علاوہ ہمارے منظورِ نظر شاعروں میں اگر ہم کسی کا نام لے سکتے ہیں تو وہ اقبالؔ ہیں۔ یہ تینوں حضرات مختلف میدانوں کے شہسوار اور مختلف جہتوں کے معمار ہیں اور اپنی اپنی جگہ آج بھی معزز اور قابلِ قدر ہیں۔ یعنی ہم آج اگر مرثیہ گوئی میں انیس کی پیروی و حمایت کرتے ہیں تو غزل گوئی میں ہمارے امام غالبؔ ہیں۔ اور یہی دونوں ہمارے میدان ہیں۔ باوجودے کہ ہم اقبال کی شاعری کو دل سے پسند کرتے ہیں ان کی پیروی کا شوق بھی رکھتے ہیں لیکن ہم اپنے میں اتنی استعداد نہیں پاتے کہ اقبال کے نقشِ قدم پر دو چار گام گھسٹ کر بھی چل سکیں۔ بات یہ ہے کہ علامہ کا لہجہ' آہنگ' اسلوب' لفظیات میں چاشنی اور کمال غنائیت' ترکیبات کی بے ساختگی' تشبیہات کا اچھوتاپن اپنانے کے لیے جس قدر علم و

ادراک کی ضرورت ہے وہ نہ اساتذہ ماسبق کے پاس تھا اور نہ آیندگان سے اس کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے۔ اقبال کا میدان شعر گوئی ہمہ جہت ہونے کے ساتھ وسیع تر بھی ہے کون سا موضوع سخن ہے جس میں اقبال نے گل بوٹے نہیں کھلائے کون سی تصویر ہے جس میں اقبال نے رنگ نہیں بھرے۔ صفت ہمہ جہتی میں اگر کوئی اقبال کے قریب ہے تو وہ نظیر اکبر آبادی ہیں لیکن ان کی شاعری میں نہ اقبال کا شکوہ لفظی ہے نہ ہمہمہ۔ نہ علم کی گہرائی اور نہ گیرائی۔ ان کی عظمت ان کے مشاہدات اور محسوسات سے عبارت ہے۔ جبکہ علامہ اقبال نے مغربی ادب کے گہرے مطالعے کے ساتھ اردو فارسی کا مطالعہ بھی نہایت عمیق نظر سے کیا ہے لیکن جتنی دقتِ نظری سے ان کے یہاں تاریخ عالم و تاریخ اسلام اور کلام باری کا مطالعہ نظر آتا ہے وہ کسی اردو اور فارسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ مولانا جلال الدین رومی کا تبحرِ علمی اور ان کے تصوف کی شان ان کی وقیع مثنوی معنوی جس کے لئے "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" تک کہہ دیا گیا ہے بجا طور پر عجوبہ روزگار ہے۔ مگر ناچیز کے خیال میں اس میں بھی اقبال کی سی ہمہ جہتی نہیں اگرچہ وہ علامہ اقبال کے پیر و مرشد ہیں۔ ہم نے جو آیندگان کی بات کی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس انحطاط شعر و ادب کے دور میں جبکہ ہر فرد بشر روزگار کی چکی میں پس رہا ہے۔ آسودہ حالی کا فقدان ہے۔ ملک سے امن و امان کی فاختہ اڑ چکی ہے۔ Anarchy کی فرمانروائی ہے۔ معیاری اور غیر معیاری کی تمیز گنج لحد میں آرام فرما ہے۔ جو منچلے آج بھی شعر وادب کی پرورش میں کوشاں ہیں وہ پانی پت کی جنگ لڑ رہے ہیں جس میں کسی طرف سے کسی طرح کی کمک آنے کی کوئی امید نہیں پروفیسر سید نواب کریم نے اپنی کتاب بنام "حالی سے کلیم تک" میں ان خیالات کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "نابغے کو پھلنے پھولنے کے لیے (نابغے سے مراد نابغۂ روزگار تخلیق کار سے ہے) مناسب فضا اور ماحول درکار ہے۔ اس فضا اور ماحول کی تعمیر میں تاریخی واقعات، ادبی روایات، سیاسی حالات، سماجی ضروریات، تہذیبی مطالبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ انگلستان میں اسے الزبتھ کے دور زریں کے

نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سیاسی، حکومتی اور معاشی استحکام، سماجی شادمانی اور تہذیبی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ادبی اقدار کی صالح روایات موجود ہوں تو تخلیقی عمل میں حسن، نکھار، بانکپن گہرائی، گیرائی اور عظمت پیدا ہونے کے امکانات روشن تر ہوتے ہیں۔ صالح ادبی اقدار کی روایات کا سرچشمہ ارسطو اور اسکے متبعین تھے۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے خیالات کس قدر حقیقت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے ملکہ الزبتھ کے دور کا ذکر کیا ہے جسے نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہی صورت حال ہمیں غیر منقسم ہندوستان جو اردو ادب کا وطن تھا وہاں بھی نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں تو اپنی اودھ، مغلیہ بادشاہوں اور دوسرے راجا رجواڑوں کے دور میں اس نابغہ کو پھلنے پھولنے کا جو موقعہ ملا اس کے نتیجے میں شاندار ادبی ذخائر وجود پذیر ہوئے جن پر ہم آج فخر سے سربلند کیے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمیں اب نشاۃ ثانیہ کی جھلک بھی دور دور تک نظر نہیں آتی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہاں اگرچہ اقبال نے ہزاروں سال محاورۃً کہا ہے اور مطلب ان کا بہت مدت سے ہے۔ امید پہ دنیا قائم ہے فیض احمد فیض کی طرح ہم بھی مدت سے بجھوتہ کیے بیٹھے ہیں۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

صاحبو ہم گفتگو اقبال پر کر رہے تھے اور ہماری یاسیت میں بات کہیں سے کہیں نکل گئی اس لیے واپسی کا ٹکٹ لیتے ہیں اور گفتگو کو وہیں سے مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں سے منقطع ہوئی تھی۔

جناب سید جمیل احمد نقوی نے اپنی کتاب "تنقید و تفہیم میں ایک مضمون "تلمیحات اقبال" کے عنوان سے لکھا ہے یہ مضمون بہت مختصر ہے مگر علامہ کی تخلیقات اور زاویہ نظر کو سمجھنے اور

ان کے مبدأ فیض کی نشاندہی کے لیے خاصہ اہم ہے۔ ہم اس مضمون سے چند سطور یہاں نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اقبال کا سرچشمہ تصوف مولانا روم ہیں، محی الدین ابن عربی، مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی وغیرہ کے نظریات سے بھی وہ کافی حد تک متاثر ہیں لیکن مولانا روم سے جو اقبال کو عقیدت ہے وہ عشق کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ علامہ کا کلام رومؔ کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ وہ رومی کو اپنا پیر ومرشد تسلیم کرتے ہیں اور بار بار اس چیز کو دہراتے ہیں ؎

بیا کہ من ز خم پیر روم آوردم
مے سخن کے جواں تر ز بادۂ عنب است

اقبال نے اپنے مردِ مومن کی بنیاد خلافت اللہ کے خالص اسلامی نظریہ پر رکھی ہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں اگر ایک طرف محی الدین ابن عربی اور عبدالکریم جیلی کے نظریات سے استفادہ کیا ہے تو دوسری طرف مولانا روم سے اثر لیا ہے۔ اقبال کے یہاں وطنیت کا جو ایک خاص نظریہ ملتا ہے اس میں بھی بعض صوفیاء کے خیالات کی گونج ہے خصوصاً رومی اور ان کے مرشد شیخ حسام الحق ضیاء الدین کی ؎

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

☆☆☆

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

ہم نے اقبال کے بارے میں جو کہا ہے وہ محض عقیدتاً نہیں کہا ہے بلکہ ہم ایسا یقین بھی رکھتے ہیں۔ ہر انسان کی طرح اقبال پر بھی To Err is human والی ضرب المثل صادق آتی ہے۔ ہمارے خیال میں زبان وبیان کی معمولی لغزشوں سے اقبال کی مجموعی شاعری پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ William Wordsworth نے Metheo Arnald کو حیرت کا فرشتہ کہہ دیا

تھا۔ مگر ہم اقبال کو فرشتہ کہہ کر اقبال کی توہین کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ یہاں ہم پروفیسر سید نواب کریم کی کتاب سے ایک اور اقتباس نقل کرتے ہیں۔

''جس شاعر نے ہمارے قومی احساسات و جذبات کو شدت سے برانگیختہ کیا وہ اقبال ہیں۔ اقبال کی شخصیت اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند اور ارفع ہے۔ مغرب و مشرق کے علوم کے دھارے اس چشمے میں مل کر بہتے ہیں۔ تاریخی شعور، فلسفیانہ میلان، حکیمانہ نظر فنکارانہ خلاقی شاعرانہ ذوق اور اختراعی قوت اس پر مستزاد ہے، تیز ادراک نکتہ رس ذہن، تازہ کار و تازہ جو تخیل، اردو شاعری کو ان سے بہت توقعات تھیں۔ انھوں نے قوم و ملت کی نیم مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا۔ ان کے منجمد احساسات کو تازہ بہاؤ دیا۔ فکر کو نئی جولانی اور نظر کو نئے زاویے دیے لیکن قومی تعمیر کے شدید جذبات نے دنیائے شاعری کی تحسین و تنظیم کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ دی۔''

پروفیسر صاحب نے ''دنیائے شاعری کی تحسین و تنظیم کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ دی'' لکھ کر اپنی فکر کو کلیم الدین احمد کی فکر سے ناحق جوڑ دیا۔ اتنی محنت اور دل کی گہرائی سے لکھی ہوئی تحریر کو وہ دودھ کا برتن کر دیا جس میں مینگنیاں گر گئی ہوں۔ بندہ پرور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال نے اپنے دائرۂ کار اپنے Agenda کو پورا کرنے میں کامیابی حاصل کی یا نہیں۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تو ''لیکن'' کیا ضرورت تھی؟ پروفیسر صاحب یہ بھی صرف آپ کی رائے ہے جبکہ اس ذیل میں بھی اقبال نے ایسے گلستان کھلائے ہیں جس پر اہل نقد و نظر صدیوں گفتگو کرتے رہیں گے اور عین ممکن ہے کہ کوئی ارسطو اٹھ کر آپ جیسے افلاطون کے نظریات سے بغاوت کا علم بلند کر دے۔

جناب کلیم الدین احمد جن کا ذکر ابھی ہم اوپر کر آئے ہیں ان کی آراء سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائے۔ فرماتے ہیں:

''اقبال کا مطمع نظر وسیع تر تھا۔ ان کا دماغ بلند پایا تھا۔ ان کے بلند اور عمیق خیالات نے قومی اور ملی شاعری کی فضا بدل دی۔ ان کی آواز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ جمود رفع ہو گیا۔ ان

کے دل جاگ اٹھے اور ان کی رگوں میں زندگی کی روح دوڑنے لگی۔ ہندوستان کے دور حاضر کا مورخ مسلمانوں کی بیداری کا اہم ترین سبب اقبال اور ان کی نظموں کو قرار دے گا۔ اقبال نے اپنی قوم وملت کی ایسی گرانقدر خدمت کی جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ اس میں بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال اردو میں بہترین قومی اور ملی شاعر ہیں۔"

کلیم الدین کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد سید محمد نواب کریم آگے چل کر ایک نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "کلیم الدین احمد جانتے ہیں کہ قومی اور ملی شاعری کا مرتبہ بلند نہیں ہوتا۔ یہاں پھر موصوف پروفیسر نے اقبال کی شعری مرتبت کو گھٹانے کی دانستہ کوشش کی ہے۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب "ادبی تنقید اور اسلوبیات" میں ایک مضمون "اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام" بھی ہے اس مضمون کا مقصد صوتیات اور اسلوبیات سے گفتگو کرنا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلوبیات لسانیات کی وہ شاخ ہے جس کا ایک سرا لسانیات اور دوسرا ادب سے جڑا ہوا ہے۔ ادب موضوعی اور جمالیاتی چیز ہے جبکہ لسانیات سماجی سائنس ہے۔"

ہر چند کہ یہ بحث ہمارے لیے بھی نیا ہے اور ہمارے مضمون سے اس کا کوئی خاص تعلق بھی نہیں۔ لیکن اس کے اختتام پر جناب گوپی چند نارنگ کی لکھی ہوئی چند سطروں نے ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کروالیا۔ سو وہ سطریں ہم آپ کے ملاحظہ کے لیے نقل کرتے چلتے ہیں ان سطروں میں اقبال، میر اور غالب کے موازنے کے بعد انھوں نے یہ سطریں درج کی ہیں:

"شعر میں نغمگی کے لیے طویل مصوتوں کے ساتھ ساتھ غنائی مصوتوں کو جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں اقبال کا کمال، جس نے اُن کے صوتیاتی آہنگ کو اردو شعریات کا معجزہ بنادیا ہے۔ دراصل یہ ہے کہ طویل اور غنائی مصوتوں کی ذہنی کیفیت اقبال کے یہاں زنانے دار، صفیری وسلسلہ دار آوازوں کی آسمانی کیفیت کے ساتھ مربوط ہے یہ ربط و امتزاج ایک ایسی صوتیاتی سطح پیش کرتا ہے جس کی دوسری نظیر اردو میں نہیں ملتی۔ اصوات کی اس خوش امتزاجی نے اقبال کے صوتیاتی آہنگ کو ایسی دلآویزی، توانائی، شکوہ اور آفاق میں سلسلہ در سلسلہ پھیلنے والی گونج عطا کی ہے جو اپنے تحرک وتموّج، امنگ اور ولولے کے اعتبار سے بجا طور پر یزداں گیر

کہی جاسکتی ہے۔"

اقبال پر یہ آسان گفتگو ہم نے سرسری اس لیے بھی کی ہے کہ ہمیں اس کتاب پر کچھ گفتگو کرنا مقصود ہے جو ہمارے لیے ایک مشکل امر ہے یعنی وہی

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقام عشق میں کھویا گیا یہ فرزانہ

اسی طرح صاحب کتاب پر جو گفتگو تھی وہ بھی آسان تھی اس لیے کہ اس میں ہم نے ان کے تعارف کے ذیل میں یادداشتوں کے سہارے اپنے تعلق خاطر اور دیرینہ مراسم کا ذکر کر کے پس پردہ اپنا قد بڑھانے کی ناکام کوشش سے پہلوتہی بھی نہیں کی۔

اس کتاب کو پڑھ کر جو پہلی بات ہمارے قیاس میں آئی وہ یہ ہے کہ یقیناً حضرت مولانا (وہ اعتراف کریں نہ کریں) حاضرات کے علم پر دسترس رکھتے ہیں اور موصوف نے اس علم کے ذریعہ اقبال کی روح کو طلب کر کے اس سے ہر شعر کے پس منظر میں اقبال کے ذہن میں جو قرآنی، حدیثی اور تاریخی حوالے تھے اس روح سے دریافت کر لیے جس کا ثبوت آپ کو قدم قدم پر اشعار کی تشریح میں قرآنی آیات، احادیث اور تاریخی منظر کی نشاندہی سے مل جاتا ہے۔ اگر ہمارا حاضرات والا قیاس غلط ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ صاحب کتاب، کتاب اللہ، احادیث کے علم میں اتنے پہنچے ہوئے ہیں کہ اقبال کے اشعار سن کر وہ فوراً اس قرآنی، حدیثی اور تاریخی حوالے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس کے پس منظر میں اقبال نے یہ اشعار کہے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں موصوف صاحب کتاب ھذا کی علمیت اور قابلیت ہی نہیں ان کے ذہن رسا کی چابکدستی پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ دوسری بات ہے ان کا انتخاب اشعار جو اس کتاب کے نام کی مناسبت سے اہل بیت اطہار سے ان کی بے پایاں عقیدت ومحبت اجاگر کرنے کی سعی مشکور ہے جس کے پس پردہ ایک اس سے قوی تر مقصد ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ ہر مکتبۂ فکر کے علمائے کرام اور ذاکرین عظام اکثر محافل ومجالس اور اسٹیج سے علامہ اقبال کے معروف شعر اپنی تقاریر و بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔

ان آفاقی ہستیوں کے شان میں علامہ اقبال کے توصیفی اشعار سے کیا کوئی اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ تو اس کا سبب کیا ہے۔ کیا یہ کوشش اپنی خطابت کا لوہا منوانے کے لیے ہوتی ہے؟ اقبال سے کہیں زیادہ انیسؔ و دبیرؔ وغیرہ نے اہل بیت کی شان میں مدح سرائی کی ہے۔ تو پھر اقبال ہی کیوں۔ صاحب کتاب کی یہ کاوش۔ یعنی یہ کتاب۔ اقبال ہی کے حوالے سے کیوں؟ خوب غور وفکر کے بعد (اول تو ہمارے غور وفکر کی حیثیت ہی کیا ہے) اس کی وجوہات جو ہماری سمجھ میں آئی وہ ہم اخلاص نیت سے یہاں درج کیے دیتے ہیں:

__ اقبال کی شخصیت، علمیت اور قابلیت کے ساتھ صدق بیانی، ادب شعر کے حوالے سے تو متنازع ہوسکتی ہے مگر عقائد کے حوالے سے شیعوں کے ساتھ ساتھ برادران اہل سنت میں بھی مسلّمہ ہے۔ میر انیس کو آپ یہ کہہ کر رد کر سکتے ہیں کہ وہ شیعی فرقہ کے نمائندہ شاعر ہیں جبکہ اقبال کی بات ایک غیر شیعی ہونے کی وجہ سے آسانی سے رد نہیں کی جاسکتی۔

__ ہر دو فرقے کے علاوہ ذاکرین۔ اور یہ بات ہم اپنے محکمہ مذہبی امور و اوقاف کے تجربے کی بنیاد پر لکھ رہے ہیں۔ اقبال کے اشعار اس لیے پڑھتے ہیں کہ وہ نیک نیتی سے اتحاد بَین المسلمین کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ اقبال جیسی شخصیت کے حوالے اور افکار کے سہارے اہل اسلام کو خیال پنجتن کی طرف راغب کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان قرون وسطی کی طرح پھر شیر وشکر ہو جائیں۔ تفرقہ پردازی کی ہوا اکھڑ جائے جس کا فائدہ دشمنان اسلام طاقتیں اٹھا رہی ہیں۔

کتاب ھذا کے محقق کا اس کتاب کی تالیف سے یہی مقصد ہے۔ موصوف نے یہ کتاب اپنی شہرت بڑھانے یا اپنے علم کو دنیا پر اجاگر کرنے یا اقبال شناسی کے زعم میں نہیں لکھی ہے۔ اس کے لیے وہ قارئین کرام سے واجبی تحسین کے حقدار ہیں۔

ہمارے خیال میں ان کی یہ کاوش۔ تقریروں میں کبھی کبھار اقبال کے شعروں کے حوالے سے دے دینے سے۔ کہیں زیادہ دور رس ثابت ہوسکتی ہے۔ اقبال کے وہ اشعار اور نظمیں جو موصوف نے اس کتاب میں ذکر کی ہیں وہ عموماً لوگ سطحی طور سے پڑھ کر یا سن کر گزر

جاتے ہیں اور ان کے پس منظر کی طرف شاید ہی متوجہ ہو پاتے ہیں۔ لیکن ان اشعار اور نظموں کی تشریح میں قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ اور ان کے تاریخی حوالوں کی موجودگی کو دیکھ کر نہ صرف وہ اقبال کے کلام کی ہمہ گیری اور معنویت کو سمجھ سکیں گے بلکہ انھیں یہ سوچنے کا موقعہ بھی ملے گا کہ اقبال کے اشعار صرف جذباتِ عقیدت کے ترجمان نہیں بلکہ یہ عقیدت و نیاز مندی حکم کتاب باری تعالیٰ کی روشنی میں اس کی پیروی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا تتبع ہے۔

کتاب زیر دست سے ہم اگر اپنی گفتگو کی سند میں مثالیں نقل کریں تو خوف ہے کہ گفتگو طویل ہو کر اپنی اہمیت کھو دے گی۔ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے جہاں سے دل چاہے کھول کر پڑھنا شروع کر دیں۔ آپ کو گوہر مقصود کی تلاش میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ایک بات اور ہے جو ہمارے خیال میں آپ بھی محسوس کریں گے کہ موصوف شاعر نہ ہونے کے باوجود شعر گوئی کے رموز اور اس کی اصطلاحات سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ موصوف نے اسی دشت کی سیاحی میں اپنی عمر بسر کی ہے۔

ہم اپنے طولِ کلام پر معافی کے خواستگار ہوتے ہوئے۔ موصوف کو اس قابلِ قدر کتاب کی دلی مبارک باد دیتے ہوئے آخر میں سعدی علیہ الرحمہ کا یہ شعر نقل کر کے قلم رکھتے ہیں جناب جمیل احمد نقوی نے اسے اقبال کا شعر لکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

احقر العباد
شہاب کاظمی جروی عفی عنہ
(ام اے اردو ادب کراچی یونیورسٹی)
مقیم مشی گن یو ایس اے

سرِّ اسمائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علامہ اقبال نے حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات احمدِ مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے ہم ان اشعار کی تشریح پیش کر رہے ہیں جن میں حضور پرنور کا ذکر ہے سب سے پہلے جن اشعار میں لفظ "محمدؐ" آیا ہے ان کی تشریح کی جا رہی ہے۔

۱۔ قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

(بانگِ درا ۲۳۱/۲۱۵)

یہ شعر جوابِ شکوہ میں ہے اور پورا بند اس طرح ہے

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

مسلمانوں نے جب سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے لائے ہوئے آئین، قانون اور دستور قرآن کریم سے رشتہ ناطہ توڑ لیا، اسے چھوڑ دیا اور ان کے عمل کا معیار مصلحت وقت قرار پاگیا اور وہ مصلحتوں کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو گئے، اغیار کا شعار ان کی آنکھوں کو بھانے لگا، طرزِ اغیار کو انھوں نے گلے لگایا ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنایا اور ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے لگے انھوں نے اپنے آباؤ اجداد اور اپنے اسلاف کی حیات کو یکسر نظر انداز کر دیا وہ ان کی طرزِ بود و باش سے بیزار ہو گئے انھیں فرسودہ اور

ناقابلِ عمل سمجھتے ہوئے اُس سے دوری اختیار کر لی، قلب میں سوز باقی نہ رہا، احساس مردہ ہو گیا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم جس پیغام کو لے کر آئے تھے مسلمانوں نے اسے بھلا دیا، فراموش کر دیا، اس پر کوئی توجہ مبذول نہ کی اور اسے بالائے طاق رکھ دیا اور مصلحتِ وقت کو اپنے عمل کا معیار بنا لیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے پوری زندگی اخلاق کا درس دیا، کردار سازی کی، مواسات و مساوات کا سبق سکھایا، رنگ ونسل کے فرق کو مٹایا عرب وعجم کی تفریق ختم کر دی امارت وغربت کو عزت وذلت کا معیار نہیں بلکہ تقویٰ کو معیارِ فضیلت وشرف قرار دیا۔

اگر ہمیں حضور انور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کا ذرا سا بھی پاس ولحاظ ہوتا تو ہم دنیا میں اس طرح ذلیل وخوار نہ ہوتے، اور در در کی ٹھوکریں نہ کھاتے، پستی سے دوچار نہ ہوتے اور قعرِ مذلت میں نہ گر جاتے۔

۲۔ قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

(بانگِ درا ۲۳۶/۲۲۰)

علامہ اقبال اس شعر میں عشق کی طاقت وقوت بیان کر رہے ہیں ان کے نزدیک عشق ایک ایسی قوت ہے جس سے انسان پستی سے بلندی کا سفر طے کر سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اگر تجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے عشق ہے الفت ہے، محبت ہے اور تیرے پاس ان کے عشق کی طاقت وقوت ہے تو تجھ پر لازم ہے کہ تو اسے بروئے کار لا کر ہر پست کو بالا کر دے پستی سے نکل کر بلندی کی جانب قدم بڑھا، مدارجِ ترقی کو طے کر کے بامِ عروج تک پہنچ جا اور تیری ذمہ داری ہے کہ تو عشقِ محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی قوت اور اس نام کی برکت سے پورے زمانے سے ظلمتوں کو دور کر دے ہر طرف بقعۂ انوار بن جائے پوری دنیا میں اسی نام کا بول بالا ہو اور اسی نام سے ہر طرف اجالا ہو، اسی نام کی خوش بو سے پورا جہان معطر اور معنبر ہو جائے اور خداوند عالم کا وعدہ پورا ہو جائے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (سورۃ التوبہ ۹: ۳۳)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دے، خواہ مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار گزرے۔

۳۔ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

(بانگِ درا ۔ ۲۳۱/۲۳۳)

یہ جوابِ شکوہ کا آخری شعر ہے۔

اللہ مسلمانوں سے مخاطب ہے اور انھیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ اے مسلمان اگر تو نے اپنے افعال، اعمال اور کردار کے ذریعے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے وفاداری کی اور ان سے کیے ہوئے وعدوں کو نبھایا ان کے کردار کو اپنایا، ان کے اخلاق سے خود کو آراستہ و پیراستہ کیا تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم خود تیرے ہو جائیں گے اور چار دانگِ عالم کو تیرا زیرِ نگیں اور تابعِ فرمان بنا دیں اور تم سیاہ و سفید کے مالک بن جاؤ گے۔

علامہ کے مطالعے کی بنیاد پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعر لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں حدیث قدسی کے یہ الفاظ بھی ہوں گے۔

عَبْدِیْ کُنْ لِیْ اَکُنْ لَکَ

اے میرے بندے تو میرا ہو جا، میں تیرا ہو جاؤں گا

میں براہِ راست تیرا نہیں ہو سکتا تجھے میرے حبیب کی بات ماننی ہو گی، تجھے ان کے اسوۂ حسنہ کو اپنانا ہوگا، تجھے ان کی اطاعت و اتباع کرنا ہوگا۔ اگر تو نے ایسا کر لیا تو پھر میں تیرا ہو جاؤں گا اور جب میں تیرا ہو جاؤں گا تو پھر کائنات کا ہر ذرہ تیرا ہو جائے اور ہر چیز تیری مطیع و منقاد ہو جائے گی، نہ صرف یہ کہ تُو پوری دنیا کا فرماں روا بن جائے گا بلکہ تیرا اختیار اور اقتدار لوح و قلم پر بھی ہوگا اور تو قضا و قدر کا مالک بن جائے گا۔

۴۔ در دلِ مُسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما زنامِ مُصطفیٰ است

(اسرار و رموز ص ۲۲۰۲۰)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہر مسلمان کے دل میں رہتے اور بستے ہیں مسلمان ان کی عزت و عظمت شان اور مقام سے آشنا ہے۔

اللہ تعالٰی نے انھیں جو مقام عطا کیا ہے وہ نہ کسی اور نبی کو ملا ہے، اور نہ ہی کسی رسول اور ولی کو ملا ہے، کائنات میں خداوند عالم کے بعد مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہے جب ہی تو شاعر نے کہا ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جو حقیقی اور صحیح مسلمان ہے وہ آنحضرتؐ کا کلمہ گو ہے اور ان کے مقام و منزلت سے آگاہ ہے وہ ظاہری طور سے نہیں بلکہ باطنی طور سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور ان کی عظمت کا قائل ہے۔ دوسرے مصرے میں اقبال اس یقین کا اظہار فرماتے ہیں کہ میری جو آبرو اور عزت ہے وہ اسی اسم مبارک سے منسلک ہونے کے سبب ہے یہاں ''آبروئے ما'' سے آبروئے مسلمان کا مطلب بھی لیا جاسکتا ہے یعنی مسلمانوں کی عزت۔

ہمیں آنحضرتؐ نے دنیا میں معزز و محترم بنایا ہے اور ان کی نسبت سے ہم دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں ہماری آبرو انھیں کے نام نامی اور اسم گرامی کی وجہ سے ہے۔

۵۔ محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

(بال جبریل ۳۳۶/۲۲)

علامہ اقبال نے اللہ تعالٰی سے شکوہ و شکایت کے انداز میں بات کہی ہے اسلوب واسوخت کا ہے اور دلچسپ ہے، نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

علامہ محولہ شعر میں فرماتے ہیں کہ نبی آخر الزماں بھی تیرے ہیں، تیرے رسول ہیں، تیرے نبی ہیں، تیرے محبوب ہیں، تیرے پسندیدہ ہیں، انھیں تیری طرف نسبت ہے تو نے ہی انھیں اتنی فضیلتوں اور کرامتوں سے نوازا ہے۔ حضرت جبریل کا تعلق بھی تیری ذات سے ہے تو نے ہی انھیں سید الملائکہ بنایا ہے۔ امینِ وحی کے منصب پر فائز کیا ہے، ان کے دشمن کو اپنا دشمن قرار دیا ہے اور قرآن جس کا نام ہے وہ بھی تیرا کلام ہے اس کا بھی تجھ سے تعلق ہے، اس کے فرامین، اس کا پیغام اس کا بیان، جو شیریں اور دل نشین ہے اے اللہ وہ تیرا ترجمان ہے یا میری ترجمانی کر رہا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ کہہ رہے ہیں یہ سب تیرا ہے، تو بندے کی ذمہ داری کیا ہے اور اس سوال میں عبودیت پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے جس کا جواب اقبال نے جواب شکوہ میں واضح طور سے دے دیا ہے۔

۶۔ دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمد و براہیم

(ضربِ کلیم ۱۵۷۱/۳۱)

علامہ اقبال نے اس شعر میں دین اور شریعت کو مسلکِ زندگی کی تقویم قرار دیا ہے۔

مسلک کے معنی ہیں راستہ اور تقویم جنتری کو کہتے ہیں وہ کتاب جس میں سال بھر کی تاریخوں، ستاروں اور گہن وغیرہ کا حال درج ہو۔

دین زندگی گزارنے اور صحیح خطوط پر زندگی بسر کرنے کا ایک لائحۂ عمل ہے، انسان اس پر چل کر، عمل پیرا ہو کر، اسے اپنا کر بہترین زندگی گزار سکتا ہے، اور مدارج حیات اور منازلِ زندگی کو احسن انداز اور بہترین صورت میں طے کر سکتا ہے اور اُسے ترقی سے ہم کنار کر سکتا ہے۔

درحقیقت دین نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور جدِ انبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا ایک راز ہے جسے آشکار کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ پہلے شخص ہیں جنھوں نے صنم کدۂ جہاں میں بتوں کے خلاف آواز بلند کی ان تراشے ہوئے بتوں کی حقیقت کو واضح کیا اور انھیں پاش پاش کر کے وحدانیت کا پرچم بلند کیا، قرآن کریم نے اس واقعے کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ۝ (سورۃ الانبیاء ۲۱: ۵۸)

چنانچہ ابراہیم نے ان بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا سوائے ان کے بڑے بت کے کہ ہوسکتا ہے یہ لوٹ پلٹ کر اس کے آس پاس آئیں۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝ (سورۃ الانبیاء ۲۱: ۵۹)

وہ کہنے لگے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟ یقیناً وہ بڑا ظالم تھا۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ۝ (سورۃ الانبیاء ۲۱: ۶۰)

کچھ لوگوں نے بتایا ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے، حضور نے ان الفاظ میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اَنَا الْفَتٰى اِبْنُ الْفَتٰى وَاَخُو الْفَتٰى (مناقب ابن شہر آشوب ج ۳ ص ۱۰۶)

میں جوان ہوں جوان کا بیٹا ہوں اور جوان کا بھائی ہوں

یہاں مراد یہ ہے کہ حضور اکرمؐ خود بت شکن ہیں اور وہ بت شکن حضرت ابراہیمؑ کے فرزند ہیں ان کی نسل اور اولاد سے ہیں اور بت شکن علی المرتضیٰ علیہ السلام کے بھائی ہیں۔

ان کی ملت کو ملتِ ابراہیم کہا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کو حکم دیا گیا

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا" (سورۃ النحل ۱۶: ۱۲۳)

پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ (اے نبی) آپ ملتِ ابراہیم کی پیروی کریں جو باطل سے کنارہ کش تھے۔

تمام انبیاء اسی دین کو لے کر آئے تھے جیسا کہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (سورۃ الشوریٰ ۴۲: ۱۳)

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ متعین کیا ہے جس کی تلقین نوح کو کی گئی تھی اور جسے وحی کے ذریعے (اے نبی) ہم نے آپ کی طرف بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰؑ کو کی تھی کہ تم دین کو قائم کرو۔

اسی وجہ سے علامہ اقبال نے اس دین کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور حضرت ابراہیم کا راز قرار دیا ہے۔

دل در سخن محمدی بند
اے پور علی ز بو علی چند

(ضرب کلیم ۳۱/۵۳۱)

علامہ اقبال "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" کے عنوان سے فرماتے ہیں

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا

اے سید زادے تو نے اپنی خودی کو گم کر دیا ہے اور تو اپنے راستے سے ہٹ گیا ہے لہٰذا تو برگساں کا حلقہ بگوش ہو گیا ہے۔

برگساں:۔ ہنری برگسان فرانسیسی فلسفی پیدائش ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء، وفات ۳ جنوری ۱۹۴۱ء

زناری۔ جنیو پہننے والا، وہ تاگا جو ہندو لوگ آڑا ترچھا گلے میں ڈالتے ہیں

اس نظم کے آخر میں علامہ اقبال ایک سید زادے سے جو مغربی فلسفے سے متاثر ہے اور بوعلی سینا کا پیروکار ہے اور اس کے فلسفیانہ نظریات سے متاثر ہے یہ کہتے نظر آتے ہیں۔

اے علی کی اولاد سے تعلق رکھنے والے تجھ پر لازم ہے کہ تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے فرمان، ان کے فرمودات ان کے اقوال کو دل میں بسائے اور اسی سے دل لگائے اس کی روشنی میں اپنی زندگی کو سجائے اور سنوار لے چوں کہ جو فلسفۂ حیات رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے دیا ہے وہ انسان کو کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے اور اس کی روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے جب کہ فلسفیوں کے فلسفے انسان کے ظاہر کو تو حسین بناتے ہیں مگر باطن، مضمحل اور کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بو علی اور بو علی میں تجانس لفظی ہے کہ اے سید زادے تجھ کو علیؑ کے راستے پر چلنا چاہیے نہ کہ بو علی کے راستے پر (بو علی کا پورا نام حکیم ابو علی بن سینا جو طب، ریاضی، منطق اور کلام میں اپنا جواب نہیں رکھتا اکثر و بیشتر علماء کی رائے میں وہ بہت بڑا فلسفی تھا، ۹۸۰ء میں پیدا ہوا ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ اس کی کتاب "قانون" بہت مشہور ہے۔)

۸۔ اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

(ضربِ کلیم ۶۱/۵۶۱)

اس نظم میں علامہ اقبال روحِ محمدؐ سے مخاطب ہیں اور نظم کا عنوان ہے "اے روحِ محمدؐ" وہ فرماتے ہیں کہ اے روحِ محمدؐ آپ اس راز کو فاش اور آشکار کر دیں کہ وہ مسلمان جو آیاتِ الٰہی کا نگہبان ہے، جس کے ذمے آیاتِ خداوندی کی نگہبانی اور حفاظت کی ذمہ داری ہے اب وہ کہاں جائے اسے کہاں پناہ ملے گی اس لیے اس دور میں مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے اور ملّتِ مرحوم کا نظام ابتر ہو گیا ہے۔

۹۔ نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدِؐ عربی سے ہے عالمِ عربی

(ضربِ کلیم ۷۷/۵۷۷)

علامہ اقبال نے ایک نظم "امرائے عرب" کے عنوان سے لکھی ہے اور یہ اس نظم کا آخری شعر ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ کافرِ ہندی بھی اس معاملے میں گفتگو کرنے کا حق رکھتا ہے اگر اس میں امرائے عرب کی بے ادبی نہ ہوتی ہو کہ

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمّت کو
وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مسلمان جہاں اور جس جگہ رہتا ہے وہی اس کا وطن بن جاتا ہے ملّتِ مسلمہ حدود و ثغور کی پابند نہیں ہوتی وہ زبان اور رنگ و نسل سے ماورا ہوتی ہے وہ سرحدوں کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ نظریہ غلط ہے کہ ملّت وطن سے ہے بلکہ وطن ملّت سے ہوتا ہے۔

☆☆☆

نوٹ: یہاں سے لفظ مصطفیٰ جن اشعار میں آیا ہے ہم ان کی تشریح کریں گے۔

۱۴۔ لا نبی بعدی ز احسانِ خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است

(اسرار رموز ۱۴۸)

حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات کو آخری نبی بنا کر بھیجا گیا اور آپ نے ببانگِ دہل اعلان فرما دیا لانبی بعدی میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا یہ اللہ تعالیٰ کا کرم و احسان ہے جو اس نے ملّتِ مُسلمہ پر کیا ہے کہ انھیں افضل الرسل اور خاتم النبیین کی اُمّت میں قرار دیا ہے۔

دینِ اسلام جو آخری منزل میں دینِ مصطفیٰ کے نام سے موسوم ہوا یہ دین بھی مصطفیٰ یعنی پسندیدہ اور منتخب روزگار ہے اور ہم تک اسے لانے والے اور ہمیں اس تک رسائی دلانے والے بھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہیں لہٰذا یہ خاتمیت دینِ مبین اور شرعِ متین کی عزت و حرمت اور عظمت و شوکت اور اس کی ناموس کا پردہ ہے۔

اس شعر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ایک حدیث کی جانب اشارہ ہے۔

(۴۴۱۶) حدثنا مُسدَّد حدثنا یحییٰ عن شعبة عن الحکم عن مصعب بن سعد عن ابیه ان رسول الله خرج الی تبوك واستخلف علیا فقال اتخلفنی فی الصبیان والنساء..قال الا ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ..الا انه لا نبی بعدی

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے اور علیؑ کو (مدینہ میں) اپنا جانشین بنایا تو حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی کہ آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں یہ سن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا (اے علیؑ) کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

الصحیح البخاری دار الغد الجدید المنصورہ ص ۸۱۵ حدیث ۴۴۱۶

جامع سنن الترمذی دار ابن حزم حدیث ۳۷۳۹ ص ۱۰۲۷

۱۳۔ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ارمغان حجاز (۶۴/۷۵۴)

علامہ اقبال تمام مسلمانوں سے مخاطب ہو کر یہ پیغام دیتے ہیں

تم اپنے آپ کو فخر موجودات حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچا دو، وہاں تک رسائی حاصل کر لو، ان کے حضور باریابی پالو، اس لیے کہ اگر مکمل دین دیکھنا ہو اور مجسم حیثیت سے دیکھنا مقصود ہو تو، وہ حضور انور کی حیات مبارکہ میں اور آپ کی ذات والا صفات میں نظر آتا ہے۔

اگر تم ان تک رسائی نہ پا سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ابولہب رسول اکرم کا چچا تھا جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رسالت کا انکار کر دیا تھا اور آپ کو اذیت پہنچاتا تھا اور اس کی بیوی بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اذیت رسانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھی قرآن کریم نے سورہ لہب کے ذریعے ان دونوں کی مذمت کی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝ مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ۝ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّ امْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ نامراد ہو گیا۔ نہ اس کا مال اس کے کسی کام آیا اور نہ ہی اس کی کمائی۔ عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کی بیوی جو ایندھن اٹھایا کرتی تھی، اس کی گردن میں مونجھ کی بٹی ہوئی رسی ہوگی۔

اس شعر میں بولہبی اس کردار کا نام ہے جو آنحضرت کی مخالفت پر کمربستہ تھا اور شرک و کفر کی نمائندگی کر رہا تھا۔

اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ علامہ اقبال نے دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

حق و باطل کی معرکہ آرائی تو ازل سے جاری و ساری ہے اللہ تعالیٰ نے جب بھی حق کا نمائندہ بھیجا باطل اس کے سامنے صف آرا ہو گیا، تاریخ کے ہر دور میں شرار بولہبی چراغ مصطفوی کو خاموش کرنے کی سعی کرتا رہا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

یہ شمع جلتی رہے گی عالم کو بقعۂ انوار بناتی رہے گی اور چاردانگ عالم میں اس کا نور پھیلتا رہے گا۔

۱۴۔ فطرتِ تو مستنیر از مصطفیٰ است
باز گو آخر مقام ما کجا است

تیری فطرت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور سے روشن ہے، تو کلمہ میں ان ہی کا نام لیتا ہے، ان کی اطاعت کرتا ہے، اپنے قلب و ذہن و فکر و خیال کو تو نے انھیں کی اقتدا اور پیروی سے منّور و فروزاں کیا ہے ذرا سوچ سمجھ کر جواب دے کہ آخر ہمارا مقام کیا ہے؟ ہم کس منزلت اور مقام کے افراد ہیں؟ آنحضرت کی اُمّت ہونے کی وجہ سے ہم تمام اُمّتوں سے افضل اور ان پر شاہد قرار پائے ہیں اور انھوں نے انسانوں کو جو عروج عطا فرمایا ہے وہ کسی دور میں میسر نہیں ہوا۔

۱۵۔ خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

(جاوید نامہ ۱۲۷/۱۵)

اقبال کے اس شعر کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ بشر کی ابتدا (تخلیق) تقدیر اور ہدایت ہے اور اس کی انتہا رحمۃ للعالمین ہو جاتا ہے تو یہ ایک عام سی خبر ہے جس میں کوئی شعریت نہیں۔ لیکن اقبال دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بشر کو اس انتہا تک پہنچنے کی جستجو کرنا چاہیے۔ اپنے کردار کو اتنا سنوارنا چاہیے کہ وہ اس حدِ انتہا کے قریب تر آسکے۔ اس سعی میں جو دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوں ان سے ہمت نہیں ہارنا چاہیے جیسا کہ غالبؔ نے کہا ہے۔ ع

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اور اسی لیے مصرع اوّل میں لفظ تقدیر لائے ہیں بشر انتہا سے آگے تو نہیں جا سکتا مگر سعی جمیل سے وہ یہاں تک پہنچ سکتا ہے کہ ع

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

حضور سرورِ کائنات جو رحمۃ للعالمین ہیں انھوں نے یہ منزلت حاصل کی وہ قاب قوسین او ادنیٰ کی منزل تک پہنچے اور یہ مقام کسی اور بشر کو حاصل نہیں ہوا۔

۱۶۔ ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرح او تفسیر آئینِ حیات

حضور انور جس دین کو لے کر آئے ہیں یعنی اسلام وہی دینِ حیات ہے، اسی دین سے قوم کی بقا ہے ارشاد فرمایا:

ان الدین عند اللہ الاسلام

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور حجۃ الوداع سے واپسی پر اس دین کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۃ المائدہ ۵:۳)

آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے پسندیدہ قرار دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے قرآن مجید کی صورت میں جس شریعت کو انسانوں کے سامنے پیش کیا وہ آئین حیات ہے، دستور زندگی اور طرز بندگی ہے۔

۱۷۔ از پیامِ مصطفیٰ آگاہ شو

فارغ از اربابِ دون اللہ شو

(رموز بیخودی ص ۱۸۸)

تم پر لازم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم جو پیغام لے کر تشریف لائے ہیں تم اس سے آگاہ ہو جاؤ یہ جان لو کہ ان کا پیغام توحید کا پیغام ہے

قُولُوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا

تم لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہو تو فلاح پا جاؤ گے۔ جب ان سے خدا کے حسب ونسب کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے سورۂ اخلاص کی تلاوت فرما کر اس کا جواب دے دیا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ ۙ وَ لَمْ یُوْلَدْ ۝ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

فرما دیجئے وہ اللہ یکتا ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔

جب تک انسان لا الٰہ نہیں کہتا وہ اربابِ باطل کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتا ہے، جب تک معبود ان باطل کی نفی نہیں ہو گی اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کا اثبات ممکن نہیں ہے۔

۱۸۔ مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید

(جاوید نامہ ۳۰۹)

علامہ اقبال کا اشارہ جس طرف ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے غار حرا میں تنہائی کی زندگی بسر کی اور ایک عرصے تک وہاں پر تنہا رہے وہاں پر ان کے علاوہ کوئی اور نہ تھا انھوں نے کسی اور کو وہاں نہیں دیکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم اخلاق حمیدہ سے متصف اور صدق و امانت میں مشہور تھے، آپ مجالس لہو و لعب میں کبھی شرکت نہ فرماتے جاہلیت کے رسم و رواج سے ہمیشہ دور رہتے سال میں ایک بار ماہ رمضان المبارک میں کوہ حرا میں جو کہ مکہ سے تین میل کے فاصلے پر منیٰ جاتے ہوئے بائیں طرف کو ہے آپ وہاں پر اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور وہیں پر ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے، چند راتوں کا توشہ ساتھ لے جاتے تھے وہ ختم ہو جاتا تو گھر تشریف لے آتے اور پھر اسی قدر توشہ لے کر حرا میں واپس جا کر اعتکاف میں مصروف ہو جاتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ غار حرا میں آپ "تحنث" یعنی عبادت کیا کرتے تھے عینی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ عبادت سے مراد "غور و فکر اور عبرت پذیری" ہے۔

ایک دن آپ حسب معمول غار حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے کہ ایک فرشتہ غیب سے نظر آیا جو آپ سے کہہ رہا تھا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ (سورۃ العلق ۹۶: ۱۔۵)

پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو علق (خون بستہ) سے خلق فرمایا، پڑھیے آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔ عمومی کتابوں میں یہ روایت اس طرح ہے کہ

آپ گھر تشریف لائے تو جلال الٰہی سے لبریز تھے، آپ نے حضرت خدیجہ سے تمام واقعہ بیان کیا وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عبرانی زبان جانتے تھے اور توریت وانجیل کے ماہر تھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے واقعہ کی کیفیت سن تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر اترا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے خطبہ قاصعہ ۱۹۲ میں ابتدائے وحی کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

اور میں ان کے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے، آپ ہر روز میرے لیے اخلاق حسنہ کے پرچم بلند کرتے تھے مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے، اور ہر سال (کوہ) حرا میں کچھ عرصہ قیام فرماتے تھے اور وہاں میرے علاوہ کوئی انھیں نہیں دیکھتا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور (ام المومنین) خدیجہ کے گھر کے علاوہ کسی گھر کی چار دیواری میں اسلام نہ تھا البتہ تیسرا ان میں میں تھا۔ میں وحی اور رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔

۱۹۔ در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

(اسرار ورموز ۲۰)

علامہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم غار حرا میں تنہائی کے عالم میں راتیں بسر کیا کرتے تھے اور قوم کی حالت دیکھ کر ان کی پستی وزبوں حالی کی وجہ سے زیادہ فکر مند رہتے اور ان کی صلاح وفلاح کے بارے میں سوچا کرتے تھے، اور آخرکار آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ایک قوم کی بنیاد ڈالی جو اُمّت وسط اور خیر الامم کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے اور انھیں قرآن کی صورت میں ایک آئین حیات فراہم کر دیا جو ہر اعتبار سے مکمل اور بھر پور رہنمائی کرنے والا ہے اور اس طرح فرمان خداوندی سے آپ نے ایک حکومت کی داغ بیل ڈال دی جو حکومت اسلامیہ کے نام سے موسوم ہے۔

اسی مضمون کو مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس حالی میں یوں پیش کیا ہے۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

☆☆

۲۰۔ چیست معراج آرزوئے شاھدے
امتحانے روبروئے شاھدے

(جاوید نامہ ۲۸۱)

علامہ اقبال نے اس شعر میں معراج کے بارے میں گفتگو کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ معراج کیا ہے؟ شاہد کی آرزو کرنا اور شاہد کے سامنے جا کر امتحان دینا۔

شاہد محبوب اور پسندیدہ ہستی کے بارے میں آتا ہے اللہ بھی شاہد ہے اور اس نے اپنے رسول کو بھی شاہد بنا کر بھیجا ہے

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝ (سورۂ احزاب ۳۳: ۴۵۔۴۶)

اے نبی بے شک ہم نے ہی آپ کو شاہد (گواہ) خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اذن خدا سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج پر اس لیے بلایا تھا کہ وہ اپنی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرائے جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا:

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝ (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷: ۱)

پاک ہے وہ جو ایک رات میں اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا تھا تاکہ ہم انھیں اپنی نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کا دیکھنے والا ہے۔

۲۱۔ رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

(اسرار و رموز ۱۱۸)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ شب و روز کی انجمن میں ہمارے ہی دم سے رونق سجاوٹ اور چہل پہل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم رسولوں کے خاتم ہیں یعنی خاتم النبیین والمرسلین ہیں اور ہم اُمتوں کے خاتم ہیں یعنی ہم اللہ کی جانب سے آخری اُمت کی حیثیت رکھتے ہیں قرآن کریم میں اس اُمت کو جو اُمتِ مُسلمہ کے نام سے مشہور ہے خیر اُمت اور اُمتِ وَسط کہا گیا ہے اور ہمارے ہی دم سے زمانے کی ہر بزم بارونق اور سجی دھجی ہے ہم دنیا میں جہاں بھی گئے اسلام کے سفیر اور نمائندہ بن کر گئے ہم نے چار دانگ عالم میں انسانیت تک اسلام کے پیغام کو عام کیا، ہر فرد بشر تک اسلام کی تعلیمات کو پہنچایا اور ہر ایک کو اسلام سے روشناس کرایا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

(شکوہ ۱۹۳۔۱۷۷)

ارشاد ہوا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (سورۃ آل عمران ۳: ۱۱۰)

تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے باہر لایا گیا ہے تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو

اور انھیں برائی سے روکتے ہو اور تمہارا ایمان اللہ پر ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (سورۂ البقرہ ۲: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمھیں اُمّتِ وَسَط قرار دیا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ بن جائے۔

۲۲۔ پس خدا برما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

(اسرار و رموز ۱۱۸)

اس کے بعد خداوند عالم نے ہم پر اپنی شریعت کو ختم کر دیا اور ہمارے رسول احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر اپنی رسالت کو ختم کر دیا آپ کو آخری رسول بنا کر مبعوث کیا ارشاد باری ہے

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

(سورۂ احزاب ۳۳: ۴۰)

خداوند عالم نے اس دنیا میں پانچ شریعتیں رائج کیں جیسا کہ ارشاد فرمایا

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (سورۂ الشوریٰ ۴۲: ۱۳)

تمہارے لیے اسی دین کا آئین مقرر کیا جس کی تلقین ہم نے نوح کو کی تھی اور جسے ہم نے بطور وحی اے نبی آپ کو مرحمت کیا ہے اور جس کی تاکید ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی یہ کہ دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقہ اندازی نہ کرو۔

۲۳۔ از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

(اسرار و رموز ۱۱۶)

علامہ اقبال یہ کہتے ہیں کہ رسالت ہی کی وجہ سے کائنات میں ہمارا وجود ہے اگر پیغمبر اکرم دنیا میں تشریف نہ لاتے تو پھر ہم کہاں ہوتے ان کی ذات اقدس تو باعث ایجاد کائنات ہے،

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ اس پر شاہد ہے

اگر آپ نہ ہوتے تو میں افلاک (آسمانوں) کو خلق نہ کرتا

اور كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًا (میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا) اس پر گواہ ہے

اور رسالت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی وجہ سے ہمارا دین بھی ہے آئین بھی ہے دستور بھی ہے قانون بھی ہے اس لیے کہ وحی اللہ کا آخری پیغام قرآن کی صورت میں عالم انسانیت اور بنی نوع انسان کے لیے لائے تھے اور آپ پر ہی دین کی تکمیل ہوئی تھی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۃ المائدہ ۵: ۳)

نے اس بات پر مہر ثبت کر دی لفظ تکوین کون سے نکلا ہے اور لفظ کُن سے پوری کائنات وجود میں آئی ہے اسی لیے اس دنیا کو عالم تکوینی کہا جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (سورۃ یٰس ۳۶: ۸۲)

بس اس کا امر یہی ہے کہ جب وہ کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے تو کن کہتا ہے اور وہ شے وجود میں آجاتی ہے معصوم فرماتے ہیں کہ لفظ "کُن" ہمارے سمجھانے کے لیے ہے ورنہ اللہ کو اس کے کہنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ اس کی مشیت ہی کسی شے کے ظہور کا سبب بن جاتی ہے۔

۲۳۔ دین فطرت از نبی آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم

(اسرار و رموز، رموز بے خودی ۱۰۲)

رموز بے خودی میں رکن دوم کا عنوان ہے "رسالت" اسی کے ذیل میں رسالت و نبوت سے متعلق بہت سے اشعار ہیں۔

علامہ اقبال یہ فرماتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے، اور ہم نے اس دین کو اپنے نبی

اکرم سے سیکھا ہے اور ہم نے حق کے راستے میں یہ شمع روشن کی ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۂ روم ۳۰:۳۰)

تم اپنا رخ سیدھا رکھو دین حق کے لیے سب راستوں سے ہٹ کر، اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت بدلی نہیں جا سکتی، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔

تمام انبیاء اسی دین کے مُبلّغ اور داعی تھے جس کا نام اسلام ہے اور یہی دین حضور اکرم کو دیا گیا اور آپ ہی کے ذریعے اس نے تکمیل کے مَراحل طے کیے اور ۱۰ ھ کو اسے تکمیل کی سند ملی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (سورۂ المائدہ ۵:۳)

آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے دین کی حیثیت سے پسندیدہ قرار دیا۔

یہ دین، دینِ فطرت ہے اسی لیے حدیث نبوی میں آیا ہے

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ وَيُمَجِّسَانِهٖ

ہر بچہ فطرت پر جنم لیتا ہے اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، اسے جیسا ماحول میسر آتا ہے وہ اسی ماحول میں ڈھل جاتا ہے اور اس ماحول کے اثرات کو قبول کر لیتا ہے۔

اسی لیے جب مسلمان کے گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہہ کر اس کے مسلمان ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے اور جب اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے۔

علامہ اقبال اس شعر میں یہ فرما رہے ہیں کہ دینِ اسلام جو دینِ فطرت ہے، اسے ہم نے رسولِ اسلام سے سیکھا ہے اور ہم ہی بحیثیت ایک قوم کے اس مشعل کو لے کر آگے بڑھے ہیں اور پوری دنیا میں اسلام کی روشنی پہنچائی ہے اور اس کے پیغام کو عام کیا ہے دل و دماغِ انسانی اور فکرِ بشر نت کو اس پیغام سے منوّر اور فروزاں کیا ہے۔

۲۵۔ این گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یکجائیم از احسانِ اوست

انھی (نبی کریم) کے بحرِ بے پایاں سے یہ گوہرِ نایاب ہمیں ملا ہے یعنی عالمِ انسانیت پر دنیائے شریعت پر یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کا احسان ہے کہ دینِ مبین جس کا نام اسلام ہے اور آئین جس کا نام قرآن ہے انھیں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ علامہ اقبال آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی ذات والا صفات کو سمندر سے تعبیر کر رہے ہیں جو ناپیدا کنار ہے، وسیع و عریض ہے اور دینِ مبین اور شرعِ متین کو گوہرِ آبدار اور لؤلؤ تاب دار سے مشابہ قرار دے رہے ہیں کہ یہ قیمتی گوہر ہمیں انھیں کے توسط سے مہیا ہوا ہے اور ہماری صفوں میں جو اتحاد و اتفاق ہے ہم جو یکجان و دو قالب ہیں تو یہ بھی انھی کا ہم پر احسان اور کرم ہے۔

اسلام سے پہلے انسانوں میں انتشار تھا، افتراق تھا، وہ بکھرے ہوئے اور منتشر تھے، بات بات پر لڑنا اور جھگڑنا ان کا شیوہ تھا، کبھی گھوڑا آگے بڑھانے پر جھگڑا، کبھی پانی پینے پلانے پر جھگڑا حرب داحس وغبرا اس کا واضح ثبوت ہے۔

اسلام نے دنیا سے انتشار و افتراق کو ختم کیا اور دولتِ ایمان کے ذریعے دشمنوں کو دوست، بیگانوں کو یگانہ، بات بات پر لڑنے جھگڑنے والوں کو شیر و شکر بنا دیا۔ علامہ نے قرآن مجید کی اس آیت سے استفادہ کیا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ (سورۂ آلِ عمران ۳:۱۰۳)

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو اور اللہ کے احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا تو اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے اور تم دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے اللہ نے تمھیں اس سے بچا لیا۔

۲۶۔ ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود

(جاوید نامہ ۳۴۱)

اس حصے میں فلک مشتری پر علامہ اقبال کی ملاقات غالب سے ہوتی ہے اور غالب زندہ رود سے مخاطب ہو کر یہ فرماتے ہیں۔

نیک بنگر اندرین بود و نبود
پی بہ پی آید جہانہا در وجود
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود

(جاوید نامہ ۳۴۰)

کہ اس دنیا کو اچھی طرح دیکھو کہ جو عدم سے وجود میں آئی اور پھر یہ سلسلہ جاری و ساری رہا اور مسلسل یکے بعد دیگرے عالم وجود میں آتے گئے ایک فنا ہوا دوسرا اس کی جگہ موجود ہو گیا اب جہاں بھی کائنات کا ہنگامہ ہوگا، کائنات کی بات ہوگی اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوگا وہاں پر آخر میں رحمۃ للعالمین حضور سرور کائنات اور فخر موجودات کا نام بھی آئے گا اس لیے کہ وہ آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ کائنات کے لیے باعث رحمت ہیں انھیں کی رحمت سے یہ کائنات منظر وجود میں آئی ہے اور

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ   اگر آپ نہ ہوتے تو میں افلاک کو خلق نہ کرتا

اس پر شاہد عادل ہے، جاوید نامہ کے ص ۳۴۱ پر فلک مشتری پر زندہ رود اور غالب میں جو مکالمہ ہوا ہے اسے نقل کر رہے ہیں۔

۲۷۔ خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہا است

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود

(جاوید نامہ ۳۴۱)

یہ شعر جاوید نامہ میں ہے، پس منظر یہ ہے کہ علامہ اقبال مولانا روم کی روح سے ملاقات کرتے ہیں اور پھر شاعر کی روح سیر افلاک کے لیے روانہ ہوتی ہے زمان و مکان کی روح کا نام زروان ہے وہ فرشتے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور مولانا روم کی ہمراہی میں شاعر کو سوئے فلک لے جاتی ہے پہلے فلک قمر کی سیر اس کے بعد فلک عطارد پھر فلک زہرہ پھر فلک مریخ پر مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے اس کے بعد فلک مشتری کی منزل آتی ہے اور یہاں پر شاعر کی ملاقات منصور حلاج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی ارواح جلیلہ سے ہوتی ہے خودی کے موضوع پر تبادلہ خیال ہوتا ہے اور زندگی کے اسرار اور رموز بیان کیے جاتے ہیں نوائے غالب سننے کے بعد زندہ رود یعنی اقبال اپنی مشکلات پیش کرتا ہے اور غالب سے گفتگو جاری رہتی ہے، غالب زندہ رود یعنی اقبال سے مخاطب ہو کر یہ فرماتے ہیں جہاں کہیں بھی عالم کا شور و غل ہوگا اور کائنات کی گہما گہمی ہوگی، دنیا کا وجود ہوگا، جہاں رنگ و آہنگ ہوگا افراد واشخاص ہوں کے چہل پہل ہوگی تو وہاں پر رحمۃ للعالمینی یعنی پوری کائنات کی رحمت بھی ہوگی قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا گیا

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ (سورۃ الانبیاء ۲۱:۱۰۷)

اور (اے نبی) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، آپ ہی کی

رحمت کے طفیل اس کائنات کا وجود ہے اور یہ کائنات آپ کی رحمت کی وجہ سے باقی اور قائم ہے اس کے بعد فرماتے ہیں۔

۲۸۔ خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

(جاوید نامہ ۳۳۱)

غالب اقبال کو سمجھاتے ہیں کہ تخلیق، تقدیر اور ہدایت یہ تو آغاز ہے اور رحمۃ للعالمین ہونا اس کی انتہا کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لفظ کن سے کائنات کو خلق کیا زمین، آسمان سورج، چاند، سیارے، ستارے، شمس و قمر، جن و بشر اور ملک و فلک سب کو زیور تخلیق سے آراستہ کیا پھر ان کی تقدیر کا فیصلہ کیا اور پھر ہدایت کا انتظام کیا۔

ان تینوں کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں کیا گیا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝

(سورۃ الاعلیٰ ۸۷: ۱۔ ۳)

(اے نبی) تسبیح کیجئے اپنے رب اعلیٰ کی جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا اور جس نے اندازہ مقرر کیا اور پھر راہ دکھائی

علامہ اقبال اس شعر میں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا تو پھر ہر شے کی تقدیر کو متعین کر دیا اور اسے راستہ دکھا دیا کہ اس کا کیا کام ہے اور یہی استدلال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کیا تھا جب اس نے سوال کیا

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ (سورۂ طٰہٰ ۲۰: ۴۹)

اے موسیٰ تم بتاؤ تمھارا رب کون ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (سورۂ طٰہٰ ۲۰: ۵۰)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کا انتظام و اہتمام کیا ہے۔

رحمۃ للعالمینی سے رحمۃ للعالمین ہونا مراد ہے اور ازلحاظ قرآن حضور پر نور رحمۃ للعالمین ہیں جو خاتم النبیین بھی ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

۲۹۔ حمدِ بے حد مر رسولِ پاک را
آں کہ ایماں داد مُشتِ خاک را

(جاوید نامہ ۲۰۸)

تمام تعریف وتوصیف وثنا مخصوص ہے رسول پاک کے لیے جنھوں نے اس انسان کو جو مٹی سے خلق ہوا ہے اُسے ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔

علامہ اقبال نے یہ مضمون فرید الدین عطار سے کچھ الفاظ کی تبدیلی سے لیا ہے۔

فرید الدین عطار کا پہلا شعر جو منطق الطیر میں ہے وہ یہ ہے

آفرین جان آفرین پاک را
آنکہ جان بخشید و ایمان خاک را

فرید الدین عطار نے یہ شعر حمد باری تعالیٰ میں کہا ہے کچھ لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ علامہ اقبال نے اسے نعت پیغمبر اکرم بنا دیا اور نہایت خوب صورت انداز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ انسان کو مشت خاک سے تعبیر کیا ہے قرآن کریم میں اسے کہیں طِينٍ لَازِبٍ، کہیں حَمَإٍ مَّسْنُونٍ اور کہیں خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ اور کہیں مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ کہا ہے، بہر حال انسان کی تخلیق میں زیادہ عنصر خاک کا ہے علامہ اقبال دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ انسان جب دنیا میں آیا اور اُس نے آنکھ کھولی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بہت سے وسائل مہیا کر دیے تھے، آنکھ، کان، عقل اور شعور، مہربان والدین۔ اور جب وہ بڑا ہوا تو قرآن نے رہنمائی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے

اس کا ہاتھ تھاما اس کے لیے اخلاق و کردار کی شمع روشن کی۔ اور اس کی بھرپور ہدایت اور رہنمائی کا سامان فراہم کیا۔

۳۰۔ ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی

(بانگِ درا ۱۸۷۔۱۷۱)

بانگِ درا میں وطنیت کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں چار بند ہیں اور ۱۲ شعر ہیں اسی میں یہ شعر بھی ہے۔

کہ وطن کو ترک کر دینا اور ہجرت کر جانا محبوبِ الٰہی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سنت اور سیرت ہے لہٰذا تو ہجرت کرنے سے نہ گھبرا اور تو دین کی بقا، اسلام کی حفاظت اور اقدار کی پاس داری کے لیے اپنے باپ دادا کے وطن کو چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی نبوت کی صداقت اور سچائی کی گواہی اپنے عمل اور کردار سے دے دے، حضورِ پُرنور نے کفار و مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے گھبرا کر اپنے باپ دادا کے شہر مکہ مکرمہ کو خیرباد کہا، جہاں آپ کا بچپن گزرا تھا اور آپ نے جہاں سے دین کی تبلیغ کا آغاز کیا تھا وہاں پر آپ کو چین سے رہنے نہ دیا گیا، نبوت کے ۱۳ویں سال آپ نے مکہ مکرمہ جہاں بیت اللہ تھا وہاں سے ہجرت کر کے یثرب کو جا بسایا جو پہلے مدینۃ النبی اور پھر مدینۂ منورہ بن گیا۔

۳۱۔ مسلم از سرِّ نبی بیگانہ شد
باز این بیت الحرم بت خانہ شد

(اسرار و رموز ۱۳۲)

یہ شعر اسرار و رموز کی ایک نظم سے ماخوذ ہے جس کا عنوان ہے "عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین"

مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے راز و رمز سے بیگانہ ہو گیا ہے اس نے حضور سرورِ کائنات کے راز ہائے سربستہ سے ابھی تک آگاہی حاصل نہیں کی ہے وہ دین، اسلام،

شریعت اور مذہب کے اسرار نہاں سے ناواقف ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر بیت الحرام کو بتوں سے پاک کر دیا تھا اور ۳۶۰ بتوں کی خدائی کو ختم کر دیا تھا، لات، مناۃ، ھبل اور عزیٰ کو مسمار کر ڈالا تھا لیکن آج کل کے ذمہ داروں نے پھر اس میں لاکر بتوں کو سجا دیا ہے، زر و جواہرات کا بت، اقتدار و اختیار کا بت اور اپنی حکومت و سلطنت کا بت، وہ ان بتوں کی صورت میں اس پر قابض ہو گئے ہیں اور اپنی مرضی اور خواہش کا دین رائج کیے ہوئے ہیں اور انھوں نے اس کی اپنی اپنی تعبیریں مقرر اور معین کر رکھی ہیں۔

اور اگر بیت الحرام سے مراد دل مومن اور قلب مومن ہے تو اس میں بھی آرزوں، آشاؤں، تمناؤں اور خواہشات کے بتوں نے قبضہ جما رکھا ہے:

از منات ولات و عزیٰ وہبل
ہر یکے دارد، بتے اندر بغل

ہر ایک اپنے بغل میں بتوں کو چھپائے ہوئے ہے از قسم لات، منات عزیٰ اور ھبل، شکلیں بدل گئی ہیں لیکن عمل تبدیل نہیں ہوا۔

علامہ اقبال دوسری جگہ فرماتے ہیں

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

حضور سرور کائنات نے ۸ ہجری میں مکہ کو فتح کیا اور فتح مکہ کے بعد آپ نے طواف سے فارغ ہو کر بیت الحرام کو بتوں سے پاک کرنے کا کام شروع کیا۔

مدارج النبوۃ از علامہ شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۴۳۔ ۳۴۴ اردو میں یہ واقعہ تفصیل سے درج ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے روز فتح مکہ خانۂ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت ڈھائے جن کی طرف قبائل عرب حج کرتے اور ان کے لیے قربانی کرتے تھے۔

بعض سیر کی کتابوں میں ہے کہ چند بڑے بت اونچی جگہوں پر نصب تھے جن تک

ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ان میں سب سے اونچا اور بڑا بت وہ تھا جسے ہبل کہتے تھے، علی المرتضیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اپنے قدم ناز کو میرے کندھوں پر رکھیے اور ان بتوں کو گرا دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا، اے علی! تم میں بار نبوت اٹھانے کی طاقت نہیں ہے تم میرے کندھوں پر آؤ اور ان بتوں کو گرا دو۔

علی المرتضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دوش مبارک پر آئے اور ان کو گرا دیا اس حالت میں حضور نے علی المرتضیٰ علیہ السلام سے پوچھا خود کو کیسا دیکھتے ہو عرض کیا یا رسول اللہ میں ایسا دیکھتا ہوں کہ گویا تمام حجابات اٹھ گئے ہیں اور میرا ساق عرش سے جا ملا ہے اور جدھر میں ہاتھ پھیلاؤں وہ چیز میرے ہاتھ میں آجاتی ہے حضور نے فرمایا "اے علی تمہارا کتنا اچھا یہ وقت ہے کہ تم کار حق ادا کر رہے ہو اور میرا حال کتنا مبارک ہے کہ میں بار حق اٹھائے ہوئے ہوں"۔

۳۲۔ غنچہ ای از شاخسار مصطفیٰ
گل شو از باد بہار مصطفیٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرہ از خلق او باید گرفت

(اسرار و رموز ۱۳)

علامہ اقبال کی کتاب اسرار و رموز ص ۱۳۰ سے ۱۳۳ تک ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے
درمعنی این کہ حسن سیرت ملت از تأدّب بآداب محمدیہ است
اس مفہوم میں کہ ملت کی حسن سیرت آداب محمدیہ کو اپنانے اور اس پر عمل کرنے میں ہے۔
اس نظم میں ۴۲ اشعار ہیں جن میں آداب محمدیہ کا نہایت خوبصورت انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال اس شعر میں فرماتے ہیں کہ تم حضرت محمد مصطفیٰ کے شاخ کی ایک کلی ہو تمہارا

ان ہی سے پیوند ہے، تمھارا ان سے دین وآئین کا رشتہ ہے تم ان ہی کے نام کا کلمہ پڑھتے ہو ان کی لائی ہوئی تعلیمات اور ان کے بتائے ہوئے اخلاق اور ان کے پیش کردہ دین پر گامزن ہو تم پر لازم ہے کہ تم بہار مصطفیٰ کی باد موافق سے پھول بن کر پوری دنیا میں خوش بو پھیلاؤ، پھلو پھولو اور شاہ راہ ترقی پر گامزن ہو جاؤ۔

انھوں نے کائنات میں جس طرح قرآنی تعلیمات اور اپنے اخلاق و کردار کے نقوش چھوڑے ہیں اس بہار سے تمھیں بھی فیض یاب ہونا چاہیے اس سے بہرہ مند اور بہرہ ور ہونا چاہیے، ان کے اخلاق حسنہ اور اعلی اخلاق سے اپنی فکر و فہم اور ادراک و شعور کو آراستہ و پیراستہ کرنا چاہیے اور اس نور سے اپنے قلوب کو منور و فروزاں کرنا چاہیے۔

اسی نظم میں علامہ اقبال نے مولانا روم کا یہ قول نقل کیا ہے

مرشدِ رومی چہ خوش فرمودہ است
آنکہ یَم در قطرہ اش آسودہ است

مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے انھوں نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

مگسل از ختم الرسل ایامِ خویش
تکیہ کم کن بر فن و برگامِ خویش

تم اپنے زمانے کا رشتہ ناتہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ سے نہ توڑو

تم کو چاہیے کہ اپنے فن اور ہنر اور اپنی کوشش و کاوش پر بھروسا کم کرو

مثنوی اسرار و رموز میں رکن دوم کا عنوان "رسالت" ہے۔

اور اس میں ۳۳ شعر ہیں

اس نظم کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

۳۳۔ تارک آفل براہیم خلیل
انبیاء را نقش پائے او دلیل

(مثنوی اسرار و رموز ص ۱۱۵)

حضرت ابراہیم نے 'لا احب الآفلین'' (میں ڈوب جانے والوں سے محبت نہیں کرتا) کہا یعنی چاند، ستاروں اور سورج کے ذریعے اللہ کی وحدانیت کا استدلال کیا کہ ان سب کا ڈوب جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی اس کا حاکم ہے جو ان پر حکومت کر رہا ہے اور وہ سب اس کا حکم تسلیم کر رہے ہیں دیگر انبیاء کے لیے ان کا نقش پا دلیل اور برہان ہے۔

اس کے بعد حضور سرورِ کائنات کی نبوت کا نہایت خوب صورت انداز میں ذکر کیا ہے۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تنِ ما جاں دمید

اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیکر (ڈھانچے) کو خلق کیا ہے اور رسالت کے ذریعے سے ہمارے مردہ تنوں میں حیات کی شمع روشن کی ہے۔

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

رسالت کے ذریعے سے دنیا میں ہمارا وجود ہے اور رسالت کی وجہ سے ہمارا دین اسلام اور ہمارا آئین قرآن باقی ہے۔

حلقۂ مِلّت محیطِ افزاستے
مرکزِ او وادیِ بطحاستے

مِلّت کا حلقہ اور دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کا مرکز وادیِ بطحا یعنی مکہ مکرمہ ہے جہاں سے حضور انور نے دعوت اسلامیہ کا آغاز کیا تھا۔

ما زِ حکمِ نسبتِ او مِلّتیم
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

ہم آنحضرت کی نسبت اور ان کے فرمان کے بموجب ایک مِلّت ''یعنی مِلّتِ مسلمہ'' ہیں اور ہم دنیا کے تمام باشندوں کے لیے رحمت کا پیغام ہیں۔

۳۴۔ دین فطرت از نبی آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم

(اسرار و رموز ص ۱۱۷)

ہم نے دین فطرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے سیکھا ہے۔ اسلام کو دین فطرت سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ تمام انبیائے کرام اسی دین کو لے کر آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے، ہر بچہ فطرت اسلام پر جنم لیتا ہے ماں باپ اور ماحول اسے کسی مذہب کا پیروکار بنا دیتا ہے، ہم نے حق کی راہ میں شعلہ روشن کیا ہے، تاکہ اس روشنی میں دوسرے لوگ بھی حق کی طرف مائل ہو جائیں" پرانے زمانے میں دیہاتوں میں یہ رواج تھا کہ گھر کی چھت پر مشعل یا چراغ جلا دیتے تھے تاکہ مسافر اس کی روشنی میں اس گھر تک پہنچ جائے اسی طرح مسلمانوں نے حق کی روشنی کو ہر فرد تک پہنچایا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات طیبہ اور حیات مبارکہ ہمارے لیے نمونۂ عمل ہے ہم نے اس دین فطرت جس کا نام اسلام ہے اس کی جملہ تعلیمات اور پیغامات ربانی کو حضور اکرم کے ذریعے اور وسیلے سے حاصل کیا ہے ان کی پوری زندگی قرآن مجید کی عملی تعبیر اور تفسیر تھی آپ نے اپنے اخلاق اور کردار کے ایسے نمونے دنیا میں چھوڑے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم فلاح و صلاح حاصل کر سکتے ہیں۔

۳۵۔ پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد

(اسرار و رموز ص ۱۱۸)

پس خداوند عالم نے ہمیں آخری ملت اور قوم بنایا اور شریعت و رسالت کو ہمارے رسول پر ختم کر دیا شریعت اس دستور آئین اور قانون کو کہتے ہیں جو زمانے اور حالات کے مطابق اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیائے اولوالعزم کے ذریعے دنیا تک بھیجا ہے، پانچ صاحب شریعت نبی ہیں

سب سے پہلے شریعت نوح علیہ السلام لے کر آئے اس کے بعد ابراہیم اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے لیے پیغام لے کر آئے جو انجیل کی صورت میں ہے اور آخری شریعت پیغمبر اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم لے کر آئے جو زمانے کا قانون تھا تاکہ ملتِ مسلمہ اس پر عمل پیرا ہو کر دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی حاصل کرے یہ قرآن اور سنت کی شکل میں امتِ محمدیہ کے لیے آیا تھا، اسی لیے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت کو ختم کر دیا۔ اور ہمارے رسول نبی آخر الزماں پر رسالت کا خاتمہ ہوا اس لیے کہ انھیں خاتم النبیین بنا کر بھیجا گیا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

(سورہ احزاب ۳۳:۴۰)

محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔
ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا ان کی لائی ہوئی شریعت آخری شریعت ہے اور یہ خود آخری نبی ہیں۔

۳۶۔ گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

(بانگ درا ۱۸۸۔۱۷۲)

سیاسی لوگوں کے نزدیک وطن کی تعریف کچھ اور ہے اور ارشادِ نبوی کی روشنی میں وطن کا تصور اور تخیل اس سے مختلف ہے۔

اقبال نے مغرب کے اس عقیدۂ وطنیت وقومیت یا نئے سیاسی تصور کے خلاف آواز بلند کی ان کے خیال میں وطنیت کا تصور صرف اس حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے کہ افغانی، ایرانی، تورانی، برطانوی، فرانسیسی، روسی، مصری اور عراقی وغیرہ ہونے کی حیثیت سے ہر فرد کو اپنے وطن سے محبت ہونی چاہیے اور ضرورت پڑنے پر اس کے لیے قربانیوں سے دریغ نہیں کرنا چاہیے، اقبال کے نظریات میں رفتہ رفتہ تبدیلی رونما ہوئی اور ان کا تصور وطنیت تبدیل ہوا اور انھوں نے

حسین احمد مدنی پر تنقید کی وہ ارمغان حجاز میں فرماتے ہیں۔

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمد عربی است

جو یہ نغمہ الاپ رہے ہیں کہ ملت وطن سے تشکیل پاتی ہے وہ لوگ دراصل مقام نبی کریم سے غافل ہیں۔ ملت کا وطن سے کوئی تعلق اور پیوند نہیں ہوتا بلکہ مذہب انسانوں کو یکجا کرتا ہے ایک لڑی میں پروتا ہے، اور جمعیت اقوام کا یہی سبب بنتا ہے۔ مسلمان جس ملک میں ہو جہاں رہتا ہو، جس جگہ زندگی بسر کرتا ہو وہی اس کا وطن ہے۔

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

۳۷۔ تجھ کو چھوڑا کہ رسول عربی کو چھوڑا؟
بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسم سلمان و اویس قرنی کو چھوڑا
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں

(بانگ درا ۱۹۰۔ ۱۷۳)

یہ بند اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" میں ہے۔ وہ سوالیہ انداز میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے شکوہ کر رہے ہیں اے اللہ کیا ہم نے تجھے چھوڑ دیا ہے، تیری عبادت نہیں کرتے ہیں، کیا ہم نے نبی اکرم کا اتباع نہیں کیا؟ یا ہم نے بت گری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے اور بت شکنی کو ترک کر دیا ہے؟ کیا عشق کو اور اس کی آشفتہ سری کو چھوڑ دیا کیا ہم نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت اویس قرنی کی سیرت سے انحراف کیا ہے۔

ایسا نہیں ہے بلکہ تکبیر کی آگ ہمارے سینوں میں دبی ہوئی ہے، اور ہماری زندگی بلال حبشی

کی مانند ہے ہم تکلیف، مصائب اور شدائد میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور صبر سے کام لے رہے ہیں۔

۳۸۔ چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعنَا لَکَ ذِکرَک دیکھے

(بانگِ درا ۲۳۶/۲۲۰)

یہ درحقیقت جوابِ شکوہ کا ایک شعر ہے مسلمانوں کی تگ و دو کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ مختلف قوموں پر لازم ہے، ضروری ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھولیں اور ابد تک یہ نظارہ دیکھتے رہیں، اور یہ دیکھیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس نبی کو یہ عظمت یہ شان اور یہ خوبی عطا کی ہے کہ اس سے خطاب کرکے فرمایا

وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾ (سورہ الم نشرح ۹۴: ۴)

اور ہم نے اے نبی آپ کے ذکر کو رفعت عطا کی ہے، ذکر کی بلندی ایسی ہے کہ جب اور جہاں خداوند عالم کا ذکر ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم سرورِ کائنات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

کی آواز بھی مسجد کے میناروں سے بلند ہوتی ہے، اور تشہد پڑھتے وقت بھی توحید کی گواہی کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رسالت و نبوت کی گواہی دی جاتی ہے، دنیا میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب پیغمبر اکرم کا ذکر نہ کیا جاتا ہو۔

۳۹۔ لیکن بلال وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر

(بانگ درا ۲۷۱۔۲۵۵)

بانگ درا میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "بلال" اس میں دس شعر ہیں۔

اس شعر میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر ہے جو موذن رسول تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو ان کی آواز بہت پسند تھی، وہ جلیل القدر صحابی تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے وہ بیت المال کے خازن بھی تھے،

بخاری و مسلم نے ان سے ۴۴ حدیثیں بھی نقل کی ہیں' رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے وصال کے بعد انھوں نے اذان دینا چھوڑ دی تھی۔

وہ بلال جو حبش کے باشندے تھے حبشی نسل سے تھے لوگ انھیں بنظرِ حقارت دیکھتے تھے لیکن اسلام نے انھیں یہ عظمت عطا کی کہ صحابۂ کرام انھیں "سَیِّدِی بِلَال" کہا کرتے تھے۔ اسلام نے ان پر ایسا کرم کیا کہ وہ سیاہ فام ہونے کے باوجود اسلام کے نور سے منور تھے اور نبی اکرم کے نورِ نبوت نے ان کی عقل، ان کے شعور، ان کے فہم و فراست کو منور اور فروزاں کر دیا تھا۔

۴۰۔ اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو یہ پیغام مرا
قبضے سے اُمت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

(بانگِ درا ۳۰۹/۲۹۳)

بانگِ درا میں غزلیات کا آغاز ہوتا ہے اور پہلی غزل کا پہلا شعر یہ ہے۔

علامہ اقبال صبح کی سہانی اور ٹھنڈی نرم و نازک ہوا کے ذریعے حضور انور کو اپنا ایک پیغام بھیجنا چاہتے ہیں اور بجائے نام لینے کے کملی والا کہا یعنی قرآن کی آیت "یاایھا المزمل" میں جس طرح اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو مخاطب کیا ہے اسی نام سے وہ بھی مخاطب کر رہے ہیں کہ کملی والے تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ یہ اُمت جو بیچارگی کی انتہا تک پہنچ گئی ہے کس مپرسی کا عالم ہے، کوئی بھی اس اُمت کی خبر لینے والا، پاسباں اور محافظ نہیں ہے یہ اُمت دین و دنیا دونوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اس کے پاس کوئی بھی دولت نہیں رہی نہ دین کی دولت نہ ہی دنیا کی دولت، یہ اُمت ٹھوکریں کھا رہی ہے، پریشان حال ہے، زبوں حالی کا شکار ہے، قعرِ مذلت میں گر چکی ہے اور اب یہ ایک مردہ اور افسردہ قوم بن چکی ہے۔

۴۱۔ وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں، وہی یٰسین وہی طٰہٰ

(بالِ جبریل ۳۶۳/۳۹)

پہلے شعر میں حضور انور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے تین القاب بیان کیے ہیں

دانائے سبل، راستوں کے جاننے والے راستوں سے واقف

ختم الرسل، رسولوں کی مہر، آخری رسول، خاتم النبیین

مولائے کل، ہر ایک کے راہنما، رہبر اور آقا

حضور پر نور نے جو دانائے سبل، ختم الرسل اور مولائے کل ہیں انھوں نے راستے کے غبار کو وہ شان، فضیلت اور عظمت عطا کر دی ہے کہ وہ وادی سینا کے لیے بھی کرن اور روشنی کا مرکز بن گیا ہے اس شعر میں تلمیح ہے۔

وادی سینا وہ وادی ہے جہاں پر حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے اصرار پر یہ دعا کی۔

قَالَ رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرۡ إِلَيۡكَۚ قَالَ لَن تَرَىٰنِي وَلَٰكِنِ ٱنظُرۡ إِلَى ٱلۡجَبَلِ فَإِنِ ٱسۡتَقَرَّ مَكَانَهُۥ فَسَوۡفَ تَرَىٰنِيۚ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُۥ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهُۥ دَكّٗا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقٗاۚ

(سورۃ الاعراف ۷: ۱۴۳)

موسیٰ نے التجا کی میرے پروردگار تو مجھے اپنا جلوہ دکھا دے کہ میں تیرا دیدار کروں، ارشاد ہوا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے لیکن پہاڑ کی جانب دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو البتہ تم مجھے دیکھ سکو گے پس جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم جس راہ سے گزرے تو آپ کے نور نے غبارِ راہ کو وہ نور، چمک اور تجلی عطا کی جو وادی سینا کے مشابہ تھی، ارشاد رب العزت ہے۔

إِنَّآ أَرۡسَلۡنَآ إِلَيۡكُمۡ رَسُولٗا شَٰهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَآ أَرۡسَلۡنَآ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ رَسُولٗا ۝ (سورۃ المزمل ۷۳: ۱۵)

بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول کو تمہارا گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی جانب رسول بھیجا تھا۔

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

دوسرے شعر میں علامہ اقبال فرماتے ہیں اگر تم حضور پر نور کو عشق و مستی کی نگاہ سے دیکھو تو تمھیں یہ نظر آئے گا کہ وہی اول ہیں یعنی اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِی (اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق کیا) کے مصداق ہیں اور وہی آخر ہیں یعنی سب سے آخری نبی ہیں تخلیق میں اول ہیں اور بعثت میں سب سے آخر میں آئے ہیں، وہی قرآن ہیں یعنی قرآن مجید کی آیتیں صامت ہیں اور انکا وجود ناطق ہے، قرآن جو کہتا ہے یہ اسے کرکے دکھاتے ہیں اور حکم قرآنی کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

اور وہی فرقان بھی ہیں یعنی حق و باطل کے مابین فرق کرنے والے ارشاد ہوا۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًاۙ

(سورۃ الفرقان ۲۵:۱)

بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان کو نازل کیا تاکہ وہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو۔

قرآن کو فرقان اس لیے کہتے ہیں کہ یہ حق و باطل کے درمیان فرق کرتا ہے تو جس پر یہ نازل ہوا ہے وہ بھی حق و باطل کے فرق کو واضح کرتا ہے یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم اسی لیے علامہ اقبال نے انھیں فرقان کہا ہے، وہی یٰسین، یہ حضور سرور کائنات کا مشہور نام ہے اور یہ سورت کا بھی نام ہے اس لیے کہ اس سورت کا آغاز اسی لفظ "یٰسٓ" سے ہوتا ہے اس کا مفہوم ہے اے سید وسردار، ارشاد باری ہے:

یٰسٓۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَۙ (سورۂ یٰس ۳۶: ۱۔۳)

یاسین، قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے (اے محمد) بے شک آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔ یہ نام آنحضرت کو بہت محبوب تھا۔

طٰہٰ: قرآن مجید کا بیسواں سورہ اس نام سے موسوم ہے:

ارشاد ہو رہا ہے:

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ (سورۂ طٰہٰ ۲۰: ۱۔۲)

اے طیّب و طاہر ہم نے قرآن کو آپ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ اتنی مشقّت برداشت کریں۔

۳۔ عالم ہے فقط مومن جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

(بال جبریل ۳۶۹/۳۵)

پوری دنیا صرف اس مومن کی میراث ہے جو جاں باز، بہادر اور شجاع ہے۔ باہمت اور جان کی بازی لگا دینے والے مومن کی وراثت میں یہ دنیا ہے، سست، کاہل اور بزدل کی اس میں کوئی جگہ نہیں ہے جو شخص صاحب لولاک نہیں ہے اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے علامہ اقبال نے اس شعر میں جد و جہد اور کوشش و کاوش کی تلقین کی ہے اس حدیث کی طرف اشارہ ہے:

مَنْ جَدَّ وَجَدَ

جس نے کوشش کی اس نے پالیا۔

ارشاد رب العزت ہے:

وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝

(سورۂ النجم ۵۳: ۳۹۔۴۰)

اور انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے سعی کی ہوگی، اور بے شک وہ اپنی کوشش کو عن قریب دیکھ لے گا۔

زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ "ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی" انسان جان دے کر ہی حیاتِ ابدی حاصل کرتا ہے جس طرح امام حسین علیہ السلام نے زندگی قربان کر کے خود بھی زندہ جاوید بن گئے اور اسلام کو بھی حیات جاودانی عطا کر دی، یہ دنیا اس مومن کے لیے ہے جو جان کی بازی لگانے سے نہیں ڈرتا، اگر وہ لولاک لما خلقت الافلاک کے ساتھ نہیں ہے تو پھر اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۳۔ تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

(بال جبریل ۸۳۔ ۳۷۳)

علامہ اقبال اس شعر میں حضور سرور کائنات فخر موجودات سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ یثرب کے مالک اے مدینہ کے والی آپ خود میرا علاج کریں، مجھے غم والم سے نجات دیں، میری پریشانیوں کو دور کریں، میں ایک کشمکش میں گرفتار ہوں مجھے اس سے بچالیں، میری عقل وخرد اور میرے فہم وادراک پر افرنگیوں کا قبضہ ہے، یہ گندم نما جو فروش ہندوستان کی سرزمین پر تاجر کے بھیس میں آئے اور انھوں نے ملک ومتاع ہند پر قبضہ کر لیا اور پورے خطے کو اپنا زیر نگیں بنا لیا، اور پھر اپنی تہذیب وتمدن کو پورے ملک میں پھیلا دیا، لہٰذا اب اس ماحول میں میرے سوچنے کا طریقہ بدل گیا ہے، میری دانش افرنگی بن گئی ہے اگر آپ میرے ایمان پر نظر دوڑائیں گے تو وہ بھی زناری بن گیا ہے اور ہندوؤں کی صحبت میں رہتے رہتے جنیو اور رسم و رسوم کا عادی ہو گیا ہے۔

لہٰذا یثرب کے والی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے التجا اور خواہش کر رہے ہیں کہ اس کی عقل اور اس کے ایمان کو افرنگیوں اور زناریوں کے اثرات سے بچا کر محفوظ بنا دیں۔

۳۴۔ تا شعار مصطفی از دست رفت
قوم را رمز بقا از دست رفت

(اسرار ورموز ۱۴۸)

ہماری بقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی بقا سے منسلک ہے جب ہم مسلمانوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے شعار کو، طریقے کو، طرز حیات کو، اخلاق حسنہ کو، سنت نبوی کو ترک کر دیا اس کی حفاظت نہیں کی اپنی زندگی میں اسے جگہ نہیں دی اپنے معمولات کو اس کے مطابق و موافق نہیں ڈھالا اس پر عمل پیرا نہیں ہوئے، تو ایسی صورت میں امت مسلمہ سے اس کی حیات اس کی زندگی اور اس کی بقا کا راز جاتا رہا، قوموں کی بقا کا راز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سربراہ کی بات کو تسلیم کرتے ہیں اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرتے ہیں اس کے بتائے ہوئے دستور اور قانون کو تسلیم کرتے ہیں اس کی زندگی کو نمونہ عمل بناتے ہیں اس کے اسوۂ حسنہ کو اپناتے ہیں جو قومیں اپنے قائد، اپنے رہبر اپنے رہنما کی تعلیمات کو چھوڑ دیتی ہیں تو پھر وہ قومیں فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اور آخر کار صفحۂ روزگار سے مٹ جاتی ہیں۔

۳۵۔ با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہان تو پیدای من

(پیام مشرق ۲۵۷)

یہ بات میں اللہ تعالیٰ سے در پردہ پوشیدہ طور سے کہہ رہا ہوں اور یا رسول اللہؐ آپ سے، میں علانیہ عرض کر رہا ہوں اس لیے کہ خداوند عالم کی ذات اقدس پنہاں اور پوشیدہ ہے اور آپ کی ذات والا ثبات عیاں اور آشکار ہے۔

ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

۳۶۔ مرد مومن در نسازد با صفات
مصطفیٰ راضی نہ شد الا بذات
چیست معراج آرزوی شاھدے
امتحانے روبروئے شاھدے

(جاوید نامہ ۲۸۱)

اقبال ان اشعار میں زندگی کے فلسفے کو سمجھا رہے ہیں اور حضور اکرم کی تعلیمات کا حوالہ دے رہے ہیں۔

علامہ اقبال کے نزدیک زندگی صرف سانس لینے، کھانے پینے، سونے جاگنے، توالد و تناسل کا نام نہیں ہے یہ زندگی تو حیوانات کو بھی حاصل ہے اور وہ انسانوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں کسی کے محکوم اور زیر نگیں نہیں ہیں وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اور پابند سلاسل نہیں ہیں۔ انسانوں کو خداوند عالم نے اشرف مخلوق بنایا ہے اس کے سر پر تکریم وتعظیم کا تاج رکھ کر اُسے "لقد کرمنا بنی آدم" سے نوازا ہے اور اکثر مخلوقات پر اسے فضیلت عطا کر دی ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک زندگی نام ہے اپنی منزل کو پالینے کا اپنی منزل تک پہنچ جانے کا گوہر مقصود کو حاصل کر لینے کا اپنے ہدف تک رسائی حاصل کرنے کا اور اپنی ذات کی حقیقت سے آشنا ہو جانے کا اس سے واقفیت حاصل کر لینے کا اور اسے بے پردہ اصلی صورت میں دیکھ لینے کا نام زندگی ہے، مردمومن کی یہ صفت ہے یہ خوبی ہے کہ وہ صرف صفات تک رسائی کو کافی نہیں سمجھتا اس لیے کہ جب حبیب اور محبوب کی بات ہوئی تو پھر بات مشاہدے تک جا پہنچی،

چیست معراج آرزوی شاھدے

امتحانے روبروئے شاھدے

اس شعر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ ہے۔

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ معراج پر لے گیا جس کا ذکر قرآن مجید کے دو سوروں میں ہے

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا" (سورۂ بنی اسرائیل ۱:۱۷)

پاک ہے وہ جو ایک رات میں اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا

جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنا دیا تھا تا کہ ہم انھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔

سورۂ والنجم کی آیت نمبرا سے نمبر ۱۸ تک معراج کا تذکرہ ہے، کہ پیغمبر اکرم نے قاب قوسین او ادنیٰ کی منزلیں طے کیں اور آیت ۱۸ میں ارشاد ہوا کہ اس (محمد) نے تو اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھا ہے علامہ اقبال نے تیسرے شعر میں یہ سوال کیا ہے کہ معراج کیا ہے؟

اور پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے کہ ''شاہد'' یعنی محبوب کی آرزو اور تمنا کا نام معراج ہے اور محبوب کے سامنے امتحان دینے کا نام معراج ہے۔ معراج کیا ہے؟ حبیب و محبوب کی ملاقات مشاھدہ، روبرو ہونا، اور حرف دل کہنا

علامہ اقبال بال جبریل ۶۴ ۳ پر فرماتے ہیں

۴۷۔ سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

حضور سرور کائنات کی معراج سے مجھے یہ پتا چلا ہے میرے علم میں اضافہ ہوا ہے مجھے معلوم ہوا ہے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی انسان کامل کا ایک رات میں ان تمام منازل کا طے کرنا اور پھر واپس آجانا یہ بتا رہا ہے کہ آسمان کی بلندیاں انسان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں یہ انسان جب کمال کی منزل کو پہنچتا ہے تو افلاک کی وسعتیں اور رفعتیں اس کے سامنے بے حقیقت اور ہیچ ہو جاتی ہیں اور ہمارے نبی تو رَحْمَۃً لِلعالمین ہیں لہٰذا عالمین تک رسائی ان کی رحمت کا تقاضا تھا یہ کوئی انوکھی اور ان ہونی بات نہ تھی۔

۴۸۔ از حدیث مصطفیٰ داری نصیب
دین حق اندر جہاں آمد غریب

یہ شعر جاوید نامہ کے ص ۳۴۱ پر ہے۔

علامہ اقبال ''زندہ رود'' کے نام سے افغانی سے گفتگو کر رہے اور افغانی سے مراد جمال الدین افغانی ہیں ان کی ملاقات فلکِ عطارد پر ہوتی ہے افغانی انھیں زندگی کے اسرار سے آشنا

کرتے ہیں اس شعر کے اوپر جو عنوان ہے اس پر "افغانی" لکھا ہوا ہے وہ ایک حدیث کی طرف اشارہ کر رہے ہیں

بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا کما بدأ فطوبیٰ للغرباء

(صحیح مسلم عن ابی ھریرہ)

اسلام کا آغاز نہایت کس مپرسی کے عالم میں وطن سے دور ہوا یعنی مدینہ منورہ میں پروان چڑھا اور عن قریب یہ پھر مسافرت سے دوچار ہوگا جیسا کہ شروع ہوا تھا قابل مبارک ہیں وہ مسافر جو اس دین کی نگہداشت کر رہے ہیں۔

کہ اے مسلمانو! تمھارے سامنے حضور پرنور کی یہ حدیث نمونہ ہے یہ تمھارے پاس موجود ہے کہ اللہ کا سچا دین دنیا میں غربت و مسافرت سے دوچار ہے لہٰذا اسے سنبھالنے اور حفاظت کرنے کی ضرورت ہے، یہ پہلے بھی اسی طرح پروان چڑھا ہے اور اب بھی یہ پوری دنیا کے مسلمانوں سے التجا کر رہا ہے کہ میری پرورش کرو، میری حفاظت کرو اور میری نگہداشت کرو

۳۹۔ از چراغ مصطفیٰ اندیشہ چیست
زانکہ او را پف زند صد بولہب

(جاوید نامہ ۳۲۲)

اقبال فلک زحرہ پر "نفرِ بعل" کے تحت یہ شعر فرماتے ہیں۔

تم کو چراغ مصطفیٰ کے بارے میں کیا فکر ہے سینکڑوں ابولہب اسے گل کرنے کے درپے ہیں۔

بعل جو مشرکین کا بت ہے وہ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ تم لوگ تو ملک ومنال اور حسب نسب کے چکر میں پھنس گئے ہو کہیں عربی عجمی کا فرق ہے تو کہیں رنگ ونسل کا کہیں وطن اور زبان کے نعرے ہیں، تم نے نہ جانے کتنے بتوں کو بنا اور سجا رکھا ہے تمھیں پیغام مصطفیٰ کا کوئی پاس اور لحاظ نہیں ہے تمھیں اس چراغ کو فروزاں اور روشن رکھنے کا کوئی خیال نہیں ہے اس کے خلاف ہزاروں ابولہب اسے پھونک سے بجھانا، خاموش کرنا اور گل کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری جگہ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

یہ کشمکش تو ازل سے جاری و ساری ہے لیکن قرآن کا وعدہ ہے۔

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝ (سورۃ الصف ۶۱:۸)

اور اللہ اپنے نور کو ماہ تمام بنا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار گزرے۔

مسلمانوں کی پستی کے اسباب کو نہایت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مرد حر افتاد در بند جہات
با وطن پیوست از یزدان گسست

آزاد منش انسان مختلف النوع اور مختلف الجہات قید خانوں میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ اس نے وطن کو اپنا لیا ہے اور خدا سے ناتا توڑ دیا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں۔

در جہاں باز آمد ایام طرب
دیں ہزیمت خوردہ از ملک و نسب

دنیا میں پھر خوشیوں کے دن آ گئے اور دین ملک و نسب کے آگے شکست کھا گیا۔

ان تمام بتوں نے انسان سے انسانیت اور مسلمان سے اس کے اسلام کو سلب کر لیا ہے۔ دشمن طاقتیں اسے پے در پے شکست دے رہی ہیں اور یہ دنیا میں ناکام و نامراد ہے۔

۵۰۔ یا ز نور مصطفیٰ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

(جاوید نامہ ۳۴۱)

علامہ اقبال فلک مشتری پر حلاج غالب اور طاہرہ کی روح سے محو گفتگو ہیں۔

حلاج یہ کہتے نظر آتے ہیں۔

ھر کجا بینی جہان رنگ و بو
آن کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

تم جہاں کہیں بھی رنگ و بو کی دنیا دیکھو جہاں تمہیں زندگی کی رمق نظر آئے تمہیں رونق نظر آئے اور جس خاک سے تمہیں آرزو اور تمنا اگتی ہوئی دکھائی دے تو سمجھ لو کہ یہ سب کچھ نور مصطفیٰ کی قیمت ہے، اسی کا حسن ہے اسی کا کرشمہ ہے یا ابھی وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تلاش میں سرگرداں ہے، ان کی جستجو میں نگر نگر گھوم رہا ہے علامہ کے نزدیک آج کائنات میں اگر اسلام کا وجود ہے، دین کا نام باقی ہے، اذان کی آواز آرہی ہے حسن اسلام کی کچھ خندہ باقی ہے تو یہ سب کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات اقدس اور وجود مقدس کا فیضان ہے۔

۵۱۔ حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست
بیخ او اندر ضمیرِ مصطفیٰ است

(پس چہ باید کرد ۲۰۲)

یہ شعر "پس چہ باید کرد" کی ایک نظم سے ماخوذ ہے جس کا عنوان ہے۔
"در اسرار شریعت" اس نظم میں ۲۸ شعر ہیں۔
اس شعر کا مطلب اس وقت سمجھ میں آئے گا جب ہم اس سے پہلے پانچ شعروں کو پڑھیں گے جو یہ ہیں:

آدمی اندر جہان خیر و شر
کم شناسد نفع خود را از ضرر

انسان اس دنیائے خیر و شر میں اپنے نفع اور فائدے کو اپنے نقصان سے کم جانتا اور پہچانتا ہے۔

کس نداند زشت و خوب کار چیست
جادۂ ای ہموار و ناہموار چیست

کسی کو نہیں معلوم کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام برا ہے اسے اچھے اور برے کام کی تمیز نہیں ہے اور اس کو یہ نہیں پتا کہ کون سا راستہ ہموار ہے اور کون سا راستہ ناہموار ہے؟

شرع بر خیزد ز اعماق حیات
روشن از نورش ظلام کائنات

شریعت زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے، ابھرتی ہے، اور اس کے نور سے کائنات کا اندھیرا اور اس کی ظلمتیں دور ہو جاتی ہے اور ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے:

گر جہان داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند این نظام

اگر دنیا حرام کردہ اشیاء کو حرام سمجھتی رہے تو پھر قیامت تک یہ نظام (اسلام) پختہ اور مضبوط رہے گا:

نیست این کار فقیہاں اے پسر
با نگاہی دیگری او را نگر

اے میرے بیٹے یہ فقیہوں کا کام نہیں ہے، تم کو چاہیے کہ اسے دوسری نظر سے دیکھو یعنی چشم بصیرت سے دیکھو اور اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھو، فقیہ کا کام حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا نہیں ہے یہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذمہ داری تھی جیسا کہ سورۂ اعراف میں فرمایا:

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (سورۃ الاعراف ۷:۱۵۷)

وہ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام بتلاتا ہے۔

حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست
بیخ او اندر ضمیر مصطفیٰ است

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے جو بھی حکم دیا ہے، حکم صادر کیا ہے، وہ حق بر عدل ہے اور اس میں تسلیم و رضا کا پہلو نمایاں ہے ان سب کی جڑیں آنحضرت کے ضمیر میں پوشیدہ ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم مقنن تھے، قانون ساز تھے، صاحب شریعت تھے قرآن پاک ان پر نازل ہوا تھا۔ انھوں نے اسی وحی کی بنیاد پر حلال وحرام کا تعین کیا اور یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کر دیا تھا۔ لہٰذا حلال محمد قیامت تک حلال اور حرام محمد قیامت تک حرام رہے گا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۵۲۔ مصطفیٰ داد از رضای او خبر
نیست در احکام دیں چیزی دگر

(پس چہ باید کرد ۳۰۲)

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے امتِ مسلمہ میں ہر فرد کو اور عمومی طور سے تمام انسانوں کو اس بات سے باخبر کیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کس بات میں پنہاں ہے؟ اور اس کے سوا دین کے احکام میں کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

اس سے پہلے اشعار میں فراق و وصال کی گفتگو اس طرح کر رہے ہیں۔

از فراق است آرزو ھا سینہ تاب
تو نمانی چوں شود او بے حجاب

اے لوگو! فراق رب کی وجہ سے تمھاری آرزوؤں نے تمھارے سینوں کو روشن کر رکھا ہے اگر ذاتِ باری تعالیٰ بے حجابانہ تم کو نظر آجائے تو تمھارا وجود مٹ جائے گا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے منتخب لوگوں کے ساتھ دیدار رب کی خواہش کی تھی تو وہ تجلی کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے موت کی آغوش میں چلے گئے اور ہلاک ہو گئے۔

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ (سورۃ الاعراف ۷: ۱۵۵)

اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر افراد منتخب کیے تاکہ وہ ان کے ساتھ مقررہ وقت پر حاضر

ہوں، جب انھیں بھونچال نے آلیا تو موسیٰ نے کہا اے رب اگر تو چاہتا تو انھیں اور مجھے پہلے ہی ہلاک کر سکتا تھا۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝

(سورۃ البقرہ ۲: ۵۵-۵۶)

اور یاد کرو وہ وقت جب تم نے کہا تھا اے موسیٰ ہم تمھاری بات کا یقین نہ کریں گے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں تو تمھارے دیکھتے ہی دیکھتے بجلی نے تم کو آلیا ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کیا کہ شاید تم شکر گزار بن جاؤ

علامہ اقبال اسی بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ "تو نمانی چوں شود او بے حجاب"...... اگر اللہ تمھیں نظر آ گیا تو تمھارا وجود مٹ جائے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

از جدائی گرچہ جان آید بلب
وصل "او" کم جو رضای "او" طلب

تم خدا سے ملنے کی کوشش نہ کرو خواہ جدائی اور فراق کے سبب تمھاری موت کا وقت آ جائے اور تم جاں بہ لب ہو جاؤ

تم اس کے وصل کی تلاش کم کرو اور اس کی رضا کی طلب میں لگ جاؤ یہ معلوم کرو کہ اللہ کن باتوں سے راضی اور خوش ہوتا ہے۔

اگر تم حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات طیبہ اور مبارکہ کا مطالعہ کرو گے تو تم کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ رضائے رب کے لیے کیا کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کو تو خود رضائے پیغمبر کا خیال تھا تبھی تو فرمایا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا (سورۃ البقرہ ۲: ۱۴۴)

ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ہم اسی قبلے کی طرف آپ کو پلٹا دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں

دوسری جگہ فرمایا:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝ (سورۃ الضحیٰ ۹۳: ۵)

اور عن قریب آپ کا رب آپ کو وہ کچھ عطا کرے گا جس سے آپ راضی ہو جائیں گے۔

اگر ہم دین کے احکام کو مختصر طور سے بیان کرنا چاہیں تو اس کا خلاصہ ہوگا کہ وہ کام کرو جس سے رب راضی ہو جائے، اس لیے کہ اسی کی رضامندی کا نام دین اسلام، شریعت اور مذہب ہے۔

۵۳۔ چوں بنام مصطفیٰ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود

(مثنوی پس چہ باید کرد ۳۰۶)

یہ شعر "سیاسیات حاضرہ" کے عنوان سے جو نظم ہے اس سے لیا گیا ہے اس نظم میں ۳۰ شعر ہیں۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیتے ہوئے درود پڑھتا ہوں تو خجالت اور شرمندگی کی وجہ سے میرا پورا وجود پانی پانی ہو جاتا ہے، میں اس نام لینے کا اہل نہیں ہوں یہ مسلمانوں کی ترجمانی ہے کہ آج کل کے دور میں نام نہاد مسلمان ہیں ان کے کام اسلام کے منافی ہیں۔

حضور اکرم کا ذکر کرنے کا حق اسی کو حاصل ہے جو ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلے ان کے لائے ہوئے دین اور شریعت پر عمل کرے ہم جب درود پڑھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں۔

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

"اے اللہ تو رحمت نازل فرما محمد اور آل محمد پر" تو اس وقت میرا سر شرمندگی سے جھک

جاتا ہے کہ ہم کس طرح اس ہستی پر درود پڑھ رہے ہیں جب کہ ہمارا کردار' ہماری گفتار ہمارا عمل ہمارا قول سب کچھ ان کے فرمان کے مطابق نہیں ہے اس کے بعد دو اشعار میں علامہ اقبال یہ فرماتے ہیں

عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر
سینۂ تو از بتان ماند دیر

عشق اس وقت یہ آواز دیتا ہے کہ اے غیر کے تابع اور غیر کا حکم ماننے والے اور اس کے محکوم تیرا سینہ تو بتوں کی وجہ سے دیر بن چکا ہے، بقول اقبال

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

تو جب تک ان بتوں سے اپنے دل کو پاک اور صاف نہیں کرے گا تو جلال و جمال خداوندی کا مشاہدہ نہ کر سکے گا۔

۵۴۔ تا نداری از محمد رنگ و بو
از درود خود میالا نام او

اگر تمھارے اندر حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے کردار کی کوئی جھلک، گفتار کا کوئی رنگ، اخلاق کا کوئی ڈھنگ، نظر نہیں آتا تم ان کا اتباع نہیں کرتے ان کی بات نہیں مانتے ان کے حکم کے سامنے سر تسلیم تم نہیں کرتے تو پھر تمھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ان پر درود بھیجو، تم درود بھیج کر ان کے نام کو آلودہ نہ کرو

۵۵۔ آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روح پاک مصطفی آمد بدرد

(پس چہ باید کرد ۳۰۸)

یہ شعر اس نظم کا حصہ ہے جس کا عنوان ہے "حرفی چند با اُمتِ عربیہ"

اے اُمتِ عربیہ تو نے جو سلوک اپنے ساتھ روا رکھا ہے وہ سلوک آج تک کسی نے اپنے ساتھ نہیں کیا۔

تیرے برتاؤ کی وجہ سے روح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بہت تکلیف پہنچی ہے۔

عموی طور سے علامہ اقبال انسانوں پھر مسلمانوں اور اس کے بعد خاص طور سے عرب کے باشندوں سے خطاب کر رہے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

ساربان را راکب تقدیر کرد

اونٹ چرانے والے کو انسانوں کی تقدیر کا راکب بنا دیا

اے صحرانشین تو نے اپنی قدر و قیمت نہیں جانی، دوسری امتیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ جو بھی خودی کے بند سے آزاد ہوا وہ مر گیا اور جس نے بھی بیگانوں سے تعلق بڑھایا وہ ختم ہو گیا اور وہ فنا کے گھاٹ اتر گیا۔

۵۶۔ در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزان بولہب

(پس چہ باید کرد ۴۳)

یہ شعر جس نظم سے لیا گیا ہے اس کا عنوان ہے۔

در حضور رسالت مآب (اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں نے عجم کی بھی سیر کی ہے وہاں بھی گیا ہوں اور عرب کا دورہ بھی کیا ہے۔ میں جہاں بھی گیا وہاں کے حالات، وہاں کا ماحول، وہاں کے شب و روز، وہاں کا رہن سہن وہاں کا چلن دیکھ کر یہی اندازہ ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم وہاں پر نایاب ہیں ان کے اسوہ حسنہ اور ان کے اخلاق کریمانہ ان کے قول و فعل اور عمل کا کہیں پتا نہیں ہے البتہ ہر جگہ ابولہب نظر آ رہا ہے۔ یعنی منفی کردار، غلط گفتار اور ابولہب کی فکر اور سوچ رکھنے والے افراد ہر طرف نظر آ رہے ہیں۔ اس شعر میں دو کرداروں کی وضاحت کی ہے ایک مصطفیٰ کا کردار دوسرا ابولہب کا کردار ہے جو آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا دشمن تھا۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمیں حضور پرنور کے کردار کو اپنانا چاہیے اور ابولہب کے کردار کو مسترد کر دینا چاہیے صرف زبان سے نہیں بلکہ عملاً اس امر کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔

۵۷۔ فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است

این تجلیات ذات مصطفیٰ است

(مثنوی مسافر ۳۱۶)

علامہ اقبال کی اس مثنوی کا عنوان "مسافر" ہے اور یہ شعر اسی سے ماخوذ ہے

اس کا پہلا شعر یہ ہے جو اس کے مطلب کی وضاحت کر رہا ہے

خسروی شمشیر و درویشی نگہ

ہر دو گوہر از محیط لاالہٗ

بادشاہت تلوار ہے اور درویشی ایک نگاہ کا نام ہے اور یہ دونوں گوہر لاالہٗ کے محیط (سمندر) میں ملتے ہیں محیط سے مراد البحر المحیط یعنی بحر اوقیانوس ہے

بادشاہت کے ساتھ درویشی بھی ضروری ہے تنہا بادشاہت یعنی تلوار کافی نہیں اس کے ساتھ ساتھ درویشانہ نگاہ بھی درکار ہے۔ اور اس کے بعد فرماتے ہیں

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است

این تجلیات ذات مصطفیٰ است

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات طیبہ اور حیات مبارکہ میں فقر و شاہی دونوں پہلو نظر آتے ہیں فقر و فاقہ بھی ہے اور حکومت و بادشاہت بھی ساتھ ساتھ ہے آنحضرت کی ذات اقدس میں دونوں کی تجلیات اور جلوے نظر آ رہے ہیں جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی عملی مظاہرہ ہوا، دشمنوں کی سرکوبی کے لیے اگر تلوار چلانا ضروری ہے تو بدر، احد، خیبر و خندق کے معرکے ہیں ورنہ فقر باعث فخر اور قابل تقلید ہے، اسی لیے فرمایا ہے اَلْفَقْرُ فَخْرِی فقر میرے لیے باعث فخر ہے۔

۵۸۔ رمز دین مصطفیٰ دانی کہ چیست

فاش دیدن خویش را شاہنشہی است

(مثنوی مسافر ۳۱۷)

یہ شعر مثنوی مسافر میں ہے اور جس نظم سے ماخوذ ہے اس کا عنوان ہے۔

خطاب بہ اقوام سرحد

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

اے زخود پوشیدہ خود را باز یاب
در مسلمانی حرام است این حجاب

اے وہ شخص جو خود سے پوشیدہ ہے تو اپنی معرفت حاصل کر لے خود اپنی ہستی سے واقف ہو جا تو خود اپنے وجود تک رسائی حاصل کر لے اس لیے کہ ایک مسلمان کے لیے اس قسم کا حجاب اس نوعیت کا پردہ حرام ہے۔

درحقیقت آفاق وانفس میں خداوند عالم کی بے شمار اور ان گنت نشانیاں موجود ہیں:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

جس نے خود کو پہچان لیا اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا انسان جتنا خود پر آشکار ہوگا اسی قدر رب اس پر واضح ہوتا چلا جائے گا یعنی خود شناسی خدا شناسی ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں:

رمز دین مصطفیٰ دانی کہ چیست
فاش دیدن خویش را شاہنشہی است

کیا تم جانتے ہو کہ دین مصطفیٰ میں کون سا راز پنہاں ہے تو میں تمہیں اس راز سربستہ اور سر نہاں سے آگاہ کر رہا ہوں۔

"ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے"

حضور سرور کائنات فخر موجودات جس دین شریعت قانون اور دستور کو لے کر آئے ہیں اس میں جو مخفی راز ہے وہ یہ ہے کہ تم خود اپنے آپ سے پوشیدہ نہ رہو بلکہ خود کو اپنی ہستی کو اپنے وجود کو بالکل واضح اور صاف طور سے دیکھو جس دن تم ایسا کر لو گے تو تم حکومت و اقتدار کے حق دار بن جاؤ گے، شہنشاہی کسی دوسرے پر حکومت و بادشاہت کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اگر تم نے خود اپنے وجود کو واضح طور سے دیکھ لیا اور

سمجھ لیا اور وہ تم پر آشکار ہو گیا تو گویا تم شہنشاہ ہو گئے۔ اور اب تمھارے وجود پر تمھاری حکم رانی ثابت ہو گئی۔

۵۹۔ می ندانی عشق و مستی از کجاست
این شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ است

(مثنوی مسافر ۴۲۲)

یہ شعر مثنوی مسافر سے ماخوذ ہے اور نظم کا عنوان ہے۔

''روحِ حکیم سنائی از بہشتِ بریں جواب می دھد''

حکیم سنائی کی روح بہشت بریں سے جواب دے رہی ہے، تمھیں معلوم نہیں، کیا تم جانتے نہیں؟ تمھیں خبر نہیں ہے کہ مجھ میں جو عشق اور مستی موجود ہے اس کا منبع کیا ہے؟ اس کا سرچشمہ کون سا ہے؟ کہاں سے یہ نور آیا ہے؟ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہ خوشی یہ سرمستی، یہ تڑپ یہ لگن یہ جوش یہ ولولہ یہ سب کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم جو آفتابِ رسالت ہیں ان کی شعاعوں کا کرشمہ اور فیضان کا نتیجہ ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے ہیں۔

تم اسی لیے زندہ ہو کہ ان کی محبت و الفت کا سوز تمھارے دل میں ہے، تمھاری روح میں اُلفت کی چنگاری بھڑک رہی ہے۔ اور یہی وہ نور ہے جو تمھارے ایمان کا محافظ اور نگہبان ہے اگر یہ نہ ہوتا تو نہ ایمان بچتا نہ ایقان بچتا، نہ دین بچتا، نہ اسلام بچتا۔

۶۰۔ مصطفیٰ بحر است و موج او بلند
خیز و این دریا بجوی خویش بند

(مثنوی مسافر ۴۲۳)

یہ شعر مثنوی مسافر سے ماخوذ ہے اس نظم کا عنوان ہے

روحِ حکیم سنائی از بہشت جواب می دھد

سنائی کی روح بہشت سے جواب دے رہی ہے

علامہ اقبال کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذاتِ اقدس ایک سمندر کی

طرح ہے جس کی امواج بلند ہو رہی ہیں اور ہر فرد تک پہنچ رہی ہیں یا اپنے اطراف واکناف تک رسائی حاصل کر رہی ہیں ان موجوں سے ہر ایک فیض یاب ہو رہا ہے۔

ان کے اخلاق حسنہ اور ان کے اوصاف حمیدہ اور ان کے افعال و کردار سے ہر ایک سیراب ہو رہا ہے، ہر ایک اس سے مستفید و مستفیض ہو رہا ہے یہ فیض و کرم اور لطف و عطا کا ایسا سمندر ہے جس سے کوئی بھی محروم نہیں ہے۔

علامہ اقبال عام انسانوں کو بالخصوص امتِ مسلمہ کو حکیم سنائی کی زبانی یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اٹھو اور اس سمندر کو اپنے دریا سے منسلک کر دو اپنے دریا کو ان سے متصل کر دو اس لیے کہ ہر ایک کا منبع اور سرچشمہ آنحضرتؐ کی ذات مقدسہ ہے، لہٰذا تمہیں بھی آنحضرت سے فیض کمال چاہیے ورنہ تم فنا ہو جاؤ گے اور صفحۂ ہستی سے مٹ جاؤ گے۔

۶۱۔ بمنزل کوش مانند مہ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقام خویش گر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو

(از ارمغان حجاز ص ۵۴)

یہ ایک رباعی ہے ارمغان حجاز میں اور اس سلسلے کا نام ہے "حضور ملت" اور اس کا ذیلی عنوان ہے۔

"بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو"

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اے انسان تو اپنی منزل کو پانے کے لیے اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے اپنی مراد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے گوہر مقصود تک رسائی کے لیے اسی طرح کوشش کر، سعی کر تمنا کر جس طرح چاند پہلی تاریخ کو نمودار ہوتا ہے تو پرانی ٹہنی کی طرح ہوتا ہے پھر وہ چودہ روز کی سعی کے بعد ماہ کامل اور ماہ تمام بن جاتا ہے تم کو چاہیے کہ اس آسمان میں ہر دم آگے بڑھنے کی کوشش اور جدوجہد کرتے رہو، دوسرے شعر میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ

اگر تم اس دنیا میں اپنا مقام اپنی منزل اپنی ہستی اور اپنے وجود کو منوانا چاہتے ہو تو پھر اس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگاؤ اسے چاہو اور حضور پرنور کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو جاؤ۔

۲۲۔ گشودم پردہ را از روی تقدیر
مشو نومید و راہِ مصطفٰی گیر

(ارمغانِ حجاز ۳۵۵)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں نے تقدیر کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا ہے لہٰذا تم کو ناامید ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ تم کو چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے کو اپناؤ اور اسی راہ پر گامزن رہو جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ہمیں دکھایا، بتایا اور جس کی نشان دہی کی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر تم اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہو اگر ترقی کی راہ پر چلنا چاہتے ہو، اگر کامیابی سے ہم کنار ہونا چاہتے ہو اگر دوسری اقوام و ملل کے ہم دوش ہونا چاہتے ہو اگر آگے بڑھنا چاہتے ہو تو تمھارے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور اخلاق کریمانہ مکمل نمونہ ہے جسے اپنا کر اور جن نقوش پر چل کر ہی تم منزل مقصود کو پاسکتے ہو اور ترقی سے ہم آغوش ہوسکتے ہو، ناامیدی گناہ کبیرہ ہے۔ اور امید پر دنیا قائم ہے۔

ارشادِ رب العزت ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (سورۃ الزمر ۳۹: ۵۳)

آپ فرما دیجئے: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جانا بے شک اللہ تمام گناہوں کا معاف فرمانے والا ہے، یقیناً وہی بخشنے والا اور شفیق و مہربان ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والا یقیناً کامیاب ہوگا لہٰذا وہ انسانوں سے یہ کہتے ہیں کہ تم ناامید مت ہو اور حضور کے راستے

کو اپناؤ۔

اس کے بعد والے شعر میں فرماتے ہیں:

اگر باور نداری آنچہ گفتم
ز دیں بگریز و مرگ کافری میر

اگر تمھیں میری بتائی ہوئی بات پر یقین نہیں ہے، اگر میرا مشورہ تم نہیں مانتے تو پھر دین کو چھوڑ دو اور راہ فرار اختیار کرو اور پھر کافری موت مرنے کے لیے تیار اور آمادہ ہو جاؤ اس لیے کہ دوسری جگہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

تم خود کو مصطفیٰ تک پہنچا دو کہ ان کی ہستی دین مکمل ہے، اگر تم ان تک نہ پہنچے تو مکمل طور سے بولہبی ہے۔

۹۳۔ وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہ مصطفیٰ
دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

(بانگِ درا ۱۵۶۔۱۷۲)

علامہ اقبال کی نظم کا عنوان ہے "بلاد اسلامیہ" یہ شعر اسی سے ماخوذ ہے۔

یثرب یعنی مدینۂ منورہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں یہ زمین ہجرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بعد مدینۃ النبی اور اس کے بعد صرف مدینہ کے نام سے موسوم ہوئی جس طرح مکہ مکرمہ کہتے ہیں اسی طرح حضور پرنور کی برکت سے اس کا نام "مدینہ منورہ" ہے اس زمین کو یہ شرف یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس زمین میں وہ مدفون ہے کائنات جس کی رہین منت ہے جو رحمۃ للعالمین ہے جو خاتم النبیین ہے جو سید الانبیاء والمرسلین ہے، خواب گاہ مصطفیٰ ہونے کی وجہ سے اس زمین کی عظمت یہ ہے کہ کعبہ خود تیری دید کا مشتاق ہے اور یہ دیدار حج اکبر سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

لوگ حج کرنے کے لیے خانہ کعبہ جاتے ہیں اور خانہ کعبہ کو اس خواب گاہ مصطفیٰ کے گرد طواف کرنے کا شوق ہے۔

۶۴۔ یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی، خاک میں اس بت کو ملا دے

(بانگ درا ۱۸۷/۱۷۱)

یہ بند بانگ درا میں ہے اور جس نظم سے ماخوذ ہے اس کا عنوان ہے۔

''وطنیت''

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

علامہ اقبال وطنیت کے جدید تصور کو باطل قرار دیتے ہیں وطن کا یہ تصور کہ ملت کا تعلق وطن سے ہے یہ ایک بت ہے جسے نئی تہذیب نے تراشا ہے، بنایا ہے، گھڑا ہے اور یہ بت ''کاشانۂ نبوی'' کو تباہ و برباد کرنے کے لیے تراشا گیا ہے۔

تیری تمام تر قوت و طاقت کا راز توحید ہے اور وہی تیری طاقت وقوت کا سرچشمہ ہے، تو مسلم ہے تو کسی زمین کا پابند نہیں ہے خطۂ ارض تیرا وطن نہیں ہے تیرے وطن کا نام اسلام ہے اس لیے کہ تیرا تعلق محمد مصطفیٰ کی ہستی اور شخصیت سے ہے اور ان کی حیثیت آفاقی اور کائناتی ہے وہ کسی حد اور سرحد کے پابند نہیں ہیں وہ عالمین کے لیے رحمت ہیں پوری کائنات ان سے فیض پا رہی ہے جہاں جہاں اسلام کی روشنی گئی ہے، جس خطۂ ارض پر محمد رسول اللہ کہا جاتا ہے اور آنحضرت کا نام لیا جاتا ہے وہ اسلام کی حد ہے اور وہی وطن ہے، بقول اقبال

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہم نے جو خدا بنا رکھے ہیں جن اصنام کو اپنے ذہنوں میں سجا رکھا ہے اور اپنی فکروں میں بسا رکھا ہے ان تازہ خداؤں میں سب سے بڑا خدا "وطن" ہے، علامہ اقبال حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ زمانے کو وہ منظر دکھا دو جس کا وہ ایک عرصے سے منتظر ہے۔

تم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار ہو تم بت شکن بن کر اس بت کو پاش پاش کر دو اس لیے کہ تم اس کی پیروی کر رہے ہو جس نے خانہ کعبہ کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا، اور خود فرمایا تھا۔

أَنَا الْفَتَى ابْنُ الْفَتَى وَأَخُو الْفَتَى

میں خود جوان ہوں، فتیٰ کا بیٹا ہوں یعنی ابراہیم کی اولاد ہوں اور فتیٰ کا بھائی ہوں یعنی علی المرتضیٰ جو بت شکن تھے میں ان کا بھائی ہوں۔ (مناقب ابن شہر آشوب)

۶۵۔ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

(بانگ درا ۲۳۵_۲۵۱)

یہ شعر بانگ درا میں ہے اور جس نظم سے ماخوذ ہے اس کا نام ہے "ارتقا"

اس نظم میں کل سات شعر ہیں اور پہلا شعر یہی ہے کہ ازل سے لے کر آج تک چراغ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابولہب کا شرار محو جنگ ہے، لڑ رہا ہے، جھگڑ رہا ہے، معرکہ کارزار گرم ہے۔

علامہ اقبال نے چراغ مصطفوی کو حق کا نمائندہ قرار دیا ہے اور شرار ابولہب کو باطل کا نمائندہ بتایا ہے۔

ازل تا امروز کا مفہوم ہے کہ اللہ جب بھی حق کا نمائندہ مقرر کرتا ہے باطل کا نمائندہ اس کے مقابل میں آ جاتا ہے اور اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس سے برسر پیکار ہوتا ہے۔

آدم علیہ السلام کے مقابلے میں شیطان، ہابیل کے مقابلے میں قابیل، ابراہیم کے

مقابل میں نمرود موسیٰ کے مقابل میں فرعون، حضورِ انور کے مقابلے میں ابولہب اور ابوجہل اور حضرت امام حسینؑ کے مقابل میں یزید نبرد آزما ہے۔ یہی اس شعر کا مفہوم ہے۔

۲۶۔ عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

(بالِ جبریل ۹۷۔۳۲۱)

یہ شعر بالِ جبریل میں ہے اور نظم کا عنوان ہے۔

"مسجدِ قرطبہ"

ہسپانیہ کی سرزمین میں بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی۔

علامہ اقبال کے نزدیک عشق عقلِ چالاک اور عیار سے افضل ہے عقل کے مختلف روپ اور رنگ ہوتے ہیں اور عشق اپنی جگہ ثابت قدم اور مستحکم رہتا ہے عشق آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے اور عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہتی ہے۔

پورا بند اس طرح ہے:

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

علامہ اقبال کے نظامِ فکر وفن میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اقبال کے نزدیک عشق عطیۂ الٰہی اور نعمتِ خداوندی ہے جسے تمام مخلوقات کو عطا کیا گیا ہے نباتات، جمادات، حیوانات اور اسلام سب کو اس کی بساط کے مطابق عشق کی دولت سے مالا مال کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال نے عقل اور عشق کا موازنہ کیا ہے اور اسے مختلف انداز سے واضح کیا ہے وہ فرماتے ہیں

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ممکن است
عقل سفاک و او سفاک تر
پاک تر، چالاک تر، بے باک تر
عقل در پیچاکِ اسباب و علل
عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقین لاینفک است

(رموزِ بے خودی ۴۷)

ایک اور جگہ پر علامہ اقبال نے عشق اور علم کا موازنہ یوں کیا ہے:

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

علامہ اقبال نے دوسری جگہ عشق وعقل کو نہایت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفی عقل تمام بولہب

علامہ اقبال نے اس شعر میں عشق اور عقل کی بحث کی ہے اور اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے علامہ اقبال کے نزدیک عشق ایک طاقت اور قوت ہے عشق ہی اللہ کا کلام ہے اور عشق ہی خدا کا رسول ہے جملہ امور کائنات عشق ہی کی وجہ سے انجام پذیر ہور ہے ہیں ان کے نزدیک عقل عیار ہے مکار ہے، سو بھیس بدل لیتی ہے دھوکہ دیتی ہے، فریب سے کام لیتی ہے۔

عقل سوچتی رہ جاتی ہے اور عشق آگے بڑھ جاتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

قران کریم میں یہ دونوں لفظ یعنی عقل و عشق نہیں آئے ہیں البتہ عقل کی مشتقات یعنی **یعقلون** اور **تعقلون** کو آیتوں میں استعمال کیا ہے۔

علامہ اقبال عقل وفہم کے مخالف نہیں البتہ ان کے ہاں عقل سے مراد "عقل ہوس پرور" ہے وہ عقل جو حرص وہوس سے جنم لیتی ہے اور اسی کے اشارے پر عمل پیرا ہوتی ہے۔علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد
عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد

(اسرار ورموز ۱۳۶)

کیا تم نے سنا ہے کہ جدال و قتال کے وقت عشق نے عقل ہوس پرور کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔

ان کے نزدیک "عشق" امام حسین علیہ السلام کے اقدام کا نام ہے اور عقل ہوس پرور یزید ہے جو امام حسین علیہ السلام سے مقابلہ کر رہا تھا اور ان سے ٹکرا رہا تھا۔

قرآن مجید میں عقل کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں مثلاً لُب جس کی جمع الباب ہے، فواد، قلب، حجی اور نُہیٰ وغیرہ۔

حسن و عشق کا تصور شاعری کا مرکز و محور رہا ہے شعراء نے اس سے حسن باطن اور عشق حقیقی مراد لیا ہے۔

میر تقی میر فرماتے ہیں:

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی رازِ نہاں ہوں

اور غالب فرماتے ہیں:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

ابن العربی کا فلسفۂ توحید یہ تھا جسے تصوف کی اصطلاح میں وحدت الوجود یا ہمہ اوست کا نام دیا گیا اس کے بعد عشق مجازی اور عشق حقیقی کی منزلیں آتی ہیں، تصوف نے اسے آگے بڑھایا اور علماء و صلحاء کے درمیان یہ موضوع گفتگو رہا۔

میر تقی میرؔ نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ

"بیٹا عشق اختیار کرو، عشق ہی اس کارخانے پر مسلط ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا، بے عشق زندگانی وبال اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے، عشق ہی بناتا اور

عشق ہی بگاڑتا ہے، عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے، آگ سوزِ عشق ہے، پانی رفتارِ عشق ہے، خاک قرارِ عشق ہے، ہوا اضطرارِ عشق ہے، موت عشق کی مستی ہے، حیات عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب ہے، دن عشق کی بیداری ہے۔

"ذکرِ میر، مرتبہ مولوی عبدالحق، مطبوعہ ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ء ص ۹"

علامہ اقبال نے عشق کو ہی دمِ جبرئیل اور عشق کو دلِ مصطفیٰ قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک عشق ہی خدا کا رسول بن کر آیا، اور اللہ نے جو کتاب قرآن کی صورت میں نازل فرمائی وہ بھی عشق کا مظہر ہے۔ اور اس عشق کا تسلسل اس رباعی میں بھی واضح ہے جس کی طرف برادرم جناب نصرت علی صاحب نے مجھے متوجہ کیا کہ میں نے علامہ اقبال کی شاہکار رباعی جس میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہایت خوب صورت انداز میں کیا گیا ہے اپنی اس کتاب میں مندرج نہیں کی رباعی یہ ہے:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذرہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اردو میں ترجمہ یہ ہے کہ

اے میرے پروردگار تو دونوں جہاں سے غنی اور میں محتاج ہوں۔

روزِ محشر جب نامۂ اعمال پیش کیے جائیں گے تو میرے عذر کو قبول کر لینا۔

اوّل تو مجھے یقین ہے کہ میرا محاسبہ نہیں ہوگا لیکن اگر تو میرا حساب لینا ضروری سمجھتا ہے تو ازراہِ کرم میرے حساب کتاب کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ سے مخفی رکھنا اس لیے کہ میں اُن کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔

مفہوم کے اعتبار سے یہ رباعی عقیدت، محبت، الفت، چاہت اور لگن سے بھرپور ہے ایک جذب و انجذاب کی کیفیت رکھتی ہے اور آنحضرتؐ سے والہانہ محبت کا بیّن ثبوت ہے۔

یہ رباعی اگرچہ علامہ اقبال کا کلام ہے لیکن ان کے کلیات میں نہیں ہے۔ عرفان صدیقی صاحب راوی ہیں کہ مولانا محمد ابراہیم ناگی جو ڈیرہ غازی خان میں سب جج تھے ان کے قریبی دوست ایک صوفی منش شاعر جن کا نام محمد رمضان عطائی تھا جنھوں نے علامہ اقبال کے اشعار پر تضمین بھی کہی ہے سرکاری اسکول کے ٹیچر تھے۔ ایک دن مولانا ابراہیم لاہور گئے علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی واپس آئے تو سرِ شام معمول کی محفل جمی علامہ سے ملاقات کا ذکر چلا تو عطائی کا جنون بڑھنے لگا۔ مولانا نے جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر عطائی کو دکھایا یہ علامہ کی اپنی تحریر تھی مولانا کہنے لگے لو عطائی علامہ صاحب کی تازہ رباعی سنو۔ پھر وہ ایک عجیب پرکیف انداز میں پڑھنے لگے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

مولانا محمد ابراہیم ناگی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے لیکن محمد رمضان عطائی کی کیفیت دگرگوں ہوگئی اسی عالم وجد میں فرش پر گر پڑے چوٹ آئی اور بیہوش ہوگئے۔ رباعی اُن کے دل پر نقش ہوکر رہ گئی اٹھتے بیٹھتے گنگناتے اور روتے رہتے وہ انھی دنوں حج کرنے گئے خود اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ جب حجاج اوراد و وظائف میں مصروف ہوتے تو وہ زار و قطار روتے اور علامہ کی یہ رباعی پڑھتے رہتے۔ حج سے واپسی پر ایک عجب آرزو کی کونپل پھوٹی کاش یہ رباعی میری ہوتی یا مجھے مل جاتی یہ خیال آتے ہی علامہ اقبال کے نام ایک خط لکھا "آپ سر" میں فقیر بے سر آپ اقبال میں فقیر مجسّم ادبار۔ انھوں نے علامہ اقبال کے اشعار کی تضمین اور اپنے فارسی اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا۔ فقیر کی تمنا ہے کہ فقیر کا تمام دیوان لے لیں اور یہ رباعی مجھے عطا فرمادیں۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ انھیں علامہ کی طرف سے ایک مختصر سا خط موصول ہوا لکھا تھا۔ جناب محمد رمضان صاحب عطائی، سینئر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان۔

لاہور ۹ فروری ۱۹۳۷ء

جناب من میں ایک مدت سے صاحب فراش ہوں۔ خط و کتابت سے معذور ہوں۔ شعر کسی کی ملکیت نہیں آپ بلا تکلف وہ رباعی جو آپ کو پسند آ گئی ہے اپنے نام سے مشہور کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

فقط محمد اقبال لاہور

علامہ نے یہ رباعی اپنی کتاب ارمغان حجاز کے لیے منتخب کی تھی عطائی کی نذر کر دینے کے بعد انھوں نے اسے کتاب سے خارج کر کے تقریباً اسی مفہوم کی حامل ایک نئی رباعی کہی جو ارمغان حجاز میں شامل ہے۔ (کلیات فارسی ص ۴۳)

به پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را
حساب من ز چشم او نہاں گیر

جب یہ دنیا اختتام پذیر ہوگی۔ تو اس وقت ہر پوشیدہ بات عیاں اور بے پردہ ہو جائے گی یعنی محشر برپا ہوگا۔

لہٰذا اے میرے پروردگار تو اس روز حضور سرور کائنات کی جناب میں مجھے رسوا نہ کرنا۔ تو میرے حساب کو ان کی نگاہوں سے مخفی رکھنا۔

☆☆☆

زہد اور رندی

علامہ اقبال کی ایک نظم بانگ درا میں ص ۹۱۔ ۹۳ جس کا عنوان ہے ''زہد اور رندی'' اس کے ۲۷ شعر ہیں اس نظم میں علامہ اقبال ایک مولوی صاحب کی کہانی سنا رہے ہیں

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصور ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

ویسے تو پوری نظم قابل توجہ ہے لیکن ہم صرف ایک شعر کی تشریح کر رہے ہیں۔

ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا
تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی

مولوی صاحب نے اقبال کو جیسا دیکھا ویسا ہی بیان کر رہے ہیں کہ اقبال کی باتوں اور اس کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ اس میں ذرا سا تشیع پایا جاتا ہے، یعنی وہ شیعیت کی طرف مائل ہے وہ شیعوں جیسی گفتگو کرتا ہے اور دوسرے مصرع میں اس کی دلیل بھی دے رہے ہیں کہ میں نے اقبال سے حضرت علی علیہ السلام کے فضائل ومحامد ومحاسن سنے ہیں وہ اصحاب کے مقابل میں حضرت علی کو افضل مانتا اور جانتا ہے۔

شیعہ ہونا کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ عین اسلام ہے جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ آیتیں نظر آتی ہیں۔

وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۝

(سورۂ الصّٰفّٰت ۳۷: ۸۳_۸۴)

اور یقیناً ابراہیم نوح کے شیعہ (ان کے طریقے پر چلنے والے) تھے جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم کے ساتھ آئے

فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۚ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ (سورۂ القصص ۲۸: ۱۵)

حضرت موسیٰ کا ذکر ہے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ دو آدمی دست وگریباں ہیں ایک ان کا شیعہ تھا اور دوسرا ان کا دشمن تھا ان کے شیعہ نے دشمن قوم والے شخص کے خلاف مدد کے لیے

آواز دی۔

قرآن کریم کی آیتوں سے پتا چلا کہ حضرت نوح اور حضرت موسیٰ کی پیروی کرنے والے کو شیعہ کہا گیا ہے۔

لفظ شیعہ کے معنی ہیں' پیروی کرنے والا ، اتباع کرنے والا، مددگار اور ''مصباح اللغات'' میں اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے اس لفظ کا غلبہ استعمال ان لوگوں کے لیے ہے جو حضرت علی علیہ السلام کے طرف دار ہیں۔

من شایع علیا فھو شیعی

جو حضرت علی کے نقش قدم پر چلے وہ شیعہ ہے۔

احادیث نبوی میں شیعہ کسے کہتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

۱۔ یا علی انت وشیعتک فی الجنہ

اے علی آپ اور آپ کے شیعہ جنتی ہیں۔

(فرائد السمطین ۱/ ۱۸۳ حدیث نمبر ۱۲۷، المناقب الخوارزمی ۱۱۳ حدیث نمبر ۱۲۳

ینابیع المودۃ جلد اول ۳۲۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ (سورۃ البینہ ۹۸:۷)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجا لائے یہی لوگ درحقیقت تمام مخلوقات سے بہتر ہیں۔

حافظ جمال الدین محمد بن یوسف زرندی، مدنی ابن عباس سے تخریج کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

یا علی انت وشیعتک خیر البریۃ تاتی یوم القیامۃ انت و شیعتک راضین مرضیین

اے علی تم اور تمھارے شیعہ خیر البریہ (تمام مخلوقات میں سب سے بہتر) ہیں اے علی

روزِ قیامت تم اور تمہارے شیعہ اس طرح آئیں گے کہ وہ راضی اور پسندیدہ ہوں گے۔
(الصواعق المحرقہ ۱۶۱ الباب الحادی عشر الفصل الاول، ینابیع المودہ ج ۲ ص ۳۵۲)

تفضیل علی ہم نے سنی اُن کی زبانی

علامہ اقبال کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کو دیگر صحابہ کرام سے افضل جانتے تھے اور یہی ان کا عقیدہ تھا۔

علامہ تفتازانی نے کہا ہے:

فلا وجہ للتوقف بل یجب ان یجزم بافضلیۃ علی

توقف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ واجب ہے کہ حضرت علی کو قطعی طور پر افضل مانا جائے
(شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ص ۷۷ مطبع مجتبائی ۱۳۴۸ھ)

افضلیتِ حضرت علی کی بہت سی دلیلیں ہیں

آیت مباہلہ میں "اَنْفُسَنَا" نبی اکرم نے حضرت علی کو اپنا نفس کہا ہے

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (سورۂ احزاب ۳۳:۶)

بلاشبہ نبی تو مومنین کے نفوس پر ان سے زیادہ اولیٰ بالتصرف ہیں۔یعنی حق تصرف رکھتے ہیں۔

لہٰذا جو نفس رسول ہے وہ دیگر صحابہ کرام سے افضل ہوگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ ایتنی باحبِّ الخلقِ الیک یاکل ھذا الطیر معی فجاء علیؑ فاکل معہ

اے اللہ میرے پاس اس ہستی کو بھیج دے جو تیرے نزدیک تمام مخلوق میں سب سے پسندیدہ ہو اور جو میرے ساتھ یہ پرندہ کھائے علی آئے اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ کھایا۔ اُسد الغابہ ترمذی شریف ص ۶۳۲ ج ۵ حدیث ۳۷۳۰

اور بھی بہت سی کتابیں

اقضاکم علیؑ

تم میں سب سے بڑے قاضی علی ہیں

اس موضوع پر رجوع کریں کتاب البرہان الجلی فی افضلیہ مولانا علی کرم اللہ وجہہ

۱۔ امام فخر الدین رازی

۲۔ علامہ احمد بن محمد بن صدیق الغماری

۳۔ شیخ محمود سعید بن محمد ممدوح

(مرتبہ خسرو قاسم علی گڑھ)

حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت کے بارے میں امام شافعی کا عقیدہ وہ فرماتے ہیں:

إِذَا نَحْنُ فَضَّلْنَا عَلِيًّا فَإِنَّنَا

رَوَافِضُ بِالتَّفْضِيلِ عِنْدَ ذَوِي الْجَهْلِ

(دیوان امام شافعی الازہر القاہرہ ص ۸۸)

جب ہم حضرت علیؑ کو افضل قرار دیتے ہیں تو صاحبانِ جہل کے نزدیک اس فضیلت کی بنیاد پر ہمیں روافض کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

کلیات باقیات شعرِ اقبال (متروک اردو کلام) ڈاکٹر صابر کلوروی نے مرتب کی ہے اس کے صفحہ ۷ پر ہے۔

تفضیلِ علیؑ کے اشعار

حضرت علی علیہ السلام سے علامہ کی بے پناہ عقیدت کا اظہار جتنا متروک کلام سے ہوتا ہے اتنا مدوّن کلام سے نہیں ہوتا، شاید اسی بنا پر ایک زمانے میں علامہ کو تشیع سے منسوب کیا گیا، ممکن ہے یہی پہلو ان اشعار کو ترک کرنے کا سبب بنا

جہاں سے ملتی تھی اقبال روح قنبر کی

مجھے بھی ملتی ہے روٹی اسی خزانے سے

ہمیشہ وردِ زباں ہے علی کا نام اقبال
کہ پیاس روح کی بجھتی ہے اس نگینے سے

پوچھتے کیا ہو مذہب اقبال
یہ گنہ گار بوترابی ہے

نوٹ: ان تین اشعار کے علاوہ اس کتاب میں پیش کیا جانے والا تمام کلام مُدوّن کلیات اور سرود رفتہ مرتبہ غلام رسول مہر صادق علی دلاوری سے ماخوذ ہے۔

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(بالِ جبریل ۷۳۔۳۹)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ مجھے فرنگیوں کی عقل و دانش کا جلوہ متاثر نہ کرسکا ان کی دانش کے جلووں نے میری آنکھ کو خیرہ نہ کیا، میں ان کی اس مادّی ترقی سے متاثر نہیں ہوا میں ان کی فکر وفہم کا دیوانہ نہیں بنا، یہ ظاہری اور مادّی ترقی مجھے متاثر نہ کرسکی کہ میں انھیں مرکزِ نگاہ اور قبلۂ نظر بنالوں ان کا اتباع کرنے لگوں اور ان کی پیروی کرنا شروع کردوں ان ہی کا دم بھرنے لگوں ان کی ہی مالا جپنے لگوں، ان ہی کے گیت گانے لگوں۔

اب بھی میرا رخ مدینہ کی طرف ہے اور میری توجہ نجف کی جانب یہی دونوں جگہیں میری امیدوں کا مرکز اور میری آرزوؤں کا محور ہیں' مدینہ منورہ میں حضور سرورِ کائنات اور فخرِ موجودات کا روضہ اقدس ہے اور وہ وہاں پر مدفون ہیں انھی کی وجہ سے یہ شہر عظمت وعزت اور شرف ومنزلت کا حامل ہے، ہر فرد کی یہ تمنا ہے کہ روضہ رسول کی زیارت کرے، اس کا مجاور بنے، وہیں پر رہائش اختیار کرے اور اسی کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنائے رکھے یعنی حضور انور ۱۴ سو سال پہلے بھی میرے لیے ہادی، رہنما اور رہبر تھے اور آج بھی ان کی ہدایتیں، ان کی رہنمائیاں ان کے مقرر کردہ اصول اور ان کی بتائی ہوئی باتیں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں، ان پر عمل پیرا ہو کر ہم دین و دنیا دونوں میں سرخرو، کامیاب اور کامران

ہو سکتے ہیں۔

دوسرا شہر جس کا ذکر اس مصرع میں ہے وہ نجف ہے نجف کوفہ کے نزدیک ایک بڑا شہر ہے، اب کوفہ ویران ہو چکا ہے اور نجف بڑا شہر بن گیا، کوفہ امیر المومنین حضرت علی کی خلافت کے زمانے میں حکومت اسلامی کا دار الخلافہ تھا مولائے متقیان نے مدینہ سے منتقل کر کے کوفے کو مرکز بنا دیا تھا اب بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں اور مسجد کوفہ میں ہی امیر المومنین کی شہادت ہوئی تھی انھیں پوشیدہ طور سے ایک مقام پر دفن کر دیا گیا تاکہ خوارج آپ کی قبر سے گستاخی نہ کر سکیں۔ بعد میں لوگوں کو آپ کی قبر کا علم ہوا جہاں پر قبر تھی وہ نجف کی سرزمین تھی نجف حضرت علی کا مدفن ہے اور آپ ہی کی وجہ سے آج نجف مرکز علم بن چکا ہے وہاں پر دینی تعلیم کے مراکز زمانہ قدیم سے قائم ہیں اور بڑے بڑے علماء بھی وہاں مدفون ہیں وہاں کی ہواؤں میں علم ہے وہاں کی فضاؤں میں علم ہے جس سینے میں صلاحیت دیکھتے ہیں اسے عالم بنا دیتے ہیں اور جس پتھر میں صلاحیت دیکھتے ہیں وہ دُرِ نجف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک مدینہ منورہ کے بعد اگر کوئی سرزمین مرکز توجہ، قبلۂ نظر اور کعبۂ نگاہ ہے تو وہ نجف کی سرزمین ہے جہاں باب مدینۃ العلم مدفون ہیں اگر ہم علمی ترقی اور علمی فروغ کے خواہاں ہیں تو ہمیں مدینہ منورہ کے ساتھ ساتھ نجف کا بھی رخ کرنا ہوگا، نہج البلاغہ جو حضرت علی علیہ السلام کے خطبات، مکتوبات اور اقوال زریں کا وقیع مجموعہ ہے اس میں وہ گوہر آب دار اور ایسے ایسے علمی نکات اور جواہر پارے ہیں جو علم کی ترقی میں راہنما بن سکتے ہیں انھوں نے کائنات کی تخلیق، آدم کی تخلیق، چرند و پرند کی تخلیق اور وحوش و طیور کے بارے میں بھی ایسے انکشافات کیے ہیں جس کے لیے محققین پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں۔

خطبہ ۱۸۳

فی صفة خلق بعض الحیوانات

النملة والجرادة

ا۔ چیونٹی کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

۲۔ اس کے بعد ٹڈی کا تذکرہ ہے۔

۳۔ خطبہ ۱۶۳

يذكر فيها عجيب خلقة الطاؤوس

مور کی عجیب و غریب خلقت کے بارے میں بیان فرمایا ہے

۴۔ خطبہ ۱۵۳

يذكر فيها بديع خلقة الخفاش

اس خطبے میں چمگادڑ کی تخلیق کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

ارمغانِ حجاز کی آخری رباعی ص ۳۸۶

قلندر میلِ تقریری ندارد
بجز این نکتہ اکسیری ندارد
از ان کشت خرابی حاصلی نیست
کہ آب از خون شبیری ندارد

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ (میں) قلندر کسی قسم کی تقریر نہیں کرنا چاہتا اور سوائے اس نکتہ کے اس کے پاس کوئی اکسیر نہیں ہے یہ کھیت جو ویران ہو گیا ہے، خراب ہو گیا ہے بنجر ہو گیا ہے اس سے کوئی فصل، اور کوئی پیداوار حاصل نہیں ہو رہی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اب اس پانی میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا خون نہیں ہے۔

علامہ اقبال اُمت کی زبوں حالی اور اسلام کی تنزلی کی داستان بیان کر رہے ہیں انھوں نے دین کو اسلام کو شریعت کو ایک کھیت سے تشبیہ دی ہے اور ۶۱ ھ میں یزید اس کو تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا، اس زمانے میں بہت سے صحابۂ کرام اور تابعین عظام موجود تھے لیکن کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ یزید سے ٹکر لیتے اور اس کے خود ساختہ نظام کو ختم کر دیتے، وہ حلال محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو حرام اور حرام محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو حلال کر رہا تھا وہ شریعت کو اپنی مرضی کے

مطابق چلانا چاہتا تھا۔

اسلام کا شجر خشک ہو رہا تھا اسلام کی کھیتی ویران ہو رہی تھی اب کوئی پانی اسے سیراب نہیں کر سکتا تھا، البتہ اس زمین کو خونِ حسینؑ کی ضرورت تھی، لہٰذا دلبندِ مصطفیؐ فرزند علیؑ و زہراؑ آگے بڑھا اور اس نے اپنے خون سے اس کھیت کو سیراب کر دیا اور وہ لہلہانے لگا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر امتِ مسلمہ ملتِ اسلامیہ کو ترقی کرنی ہے آگے بڑھنا ہے، دنیا کے ہم دوش ہونا ہے، تو پھر حسینی عزم حسینی فکر، حسینی یقین اور حسینی جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔

جب یہ ولولہ نہ ہوگا ہم ترقی نہ کر سکیں گے اور ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ ہم سفر نہ ہو سکیں گے۔

فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین

فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؑ

غزوۂ بدر اور غزوۂ حنین کی حرارت یہ عریاں فقر ہے اور امام حسینؑ کی آوازِ تکبیر بھی فقر عریاں ہے علامہ اقبال کے افکار میں فقر ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جب ہم اس لفظ پر غور کرتے ہیں تو لغت میں اس کا مفہوم فقیری، درویشی، محتاجی، تنگ دستی اور مفلسی کے آتے ہیں عموماً اردو میں اس کا استعمال فاقہ کے ساتھ ہوتا ہے "فقر و فاقہ" قرآن کریم نے یہ لفظ مختلف تراکیب سے ۱۳ جگہ استعمال کیا ہے، ارشادِ رب العزت ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (سورۃ البقرہ ۲: ۲۶۸)

شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ

(سورۃ آل عمران ۳: ۱۸۱)

اللہ نے ان لوگوں کی باتیں سن لیں جو یہ کہتے ہیں اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔

سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا:

يَآيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۝ (سورۂ فاطر ۳۵:۱۵)

اے انسانو! تم سب کے سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو بالکل بے نیاز اور لائق حمد و ثنا ہے۔

اور سورۂ محمد میں ارشاد فرمایا۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ (سورۂ محمد ۴۷:۳۸)

اللہ تو غنی ہے اور تم سب کے سب محتاج ہو۔

ان آیات کی روشنی میں ہمیں اقبال کے فلسفۂ فقر کو سمجھنے میں مدد ملے گی، فقر کی دو قسمیں ہیں ایک ممدوح ہے یعنی قابل تعریف، لائق تحسین اور دوسرا مذموم ہے یعنی مذمت کے قابل۔

کائنات کا ہر ذرہ، دنیا کا ہر شخص اور ہر شے خداوند متعال کی محتاج ہے کائنات میں غنی صمد، بے پرواہ اور بے نیاز کہلانے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔

علامہ اقبال بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

اک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری

(بال جبریل ۳۹۰_۱۶۶)

شبیری سے مراد ہے شبیر صفت ہونا امام حسین کے اسوۂ حسنہ کو اپنانا اُن کے کردار کو اپنا بنانا، شبیر ہونا ہے، ایک طرح کا فقر ہے یعنی اموال و اسباب کی کمی لشکر و عسکر کی کمی، بھوک اور پیاس کے باوجود ان کا فقر باعث فخر بن گیا انھوں نے اس فقر میں امیری کی ہے حکمرانی کی ہے۔

اور انھوں نے اس وقت کی سب سے بڑی طاقت کو شکست دے کر یہ ثابت کر دیا کہ فقر ایک طاقت ہے ایک قوت ہے ایک عزم ہے، ایک صلاحیت ہے، ایک جرأت ہے ایک ہمت ہے

لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ حضرت امام حسین نے جو عظیم سرمایہ ہمارے سپرد کیا ہے ہم اس کی حفاظت اور پاسداری کریں۔

☆☆☆

ضرب کلیم ۳۲/۵۳۲ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔

فقر وملوکیت

فقر جنگاہ میں بے ساز ویَراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون وکلیم
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقر غیور
کھا گئی روح فرنگی کو ہوائے زروسیم
عشق و مستی نے کیا ضبط نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موج نسیم

اگر ہم اس نظم کے پہلے شعر پر غور کریں تو یہ غزوۂ بدر اور کربلا پر بھی صادق آتا ہے۔

غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور کفار تعداد میں زیادہ تھے اور "لقد نصرکم اللہ ببدر و انتم اذلۃ" کی نوید نے فتح وکامرانی سے ہمکنار کر دیا۔

میدان کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ کل ۷۲ نفوس تھے جن میں بچے شیر خوار اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ سامان جنگ مہیا نہ تھا پانی بند تھا دشمنوں کی تعداد کم سے کم تیس ہزار تھی ورنہ زیادہ کی کوئی حد نہیں لاکھوں تک جاتی ہے۔ یہ شعر اس کے پس منظر میں ہے۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم

کربلا میں جب امام حسینؑ گھوڑے سے زمین کی طرف آرہے تھے تو آواز قدرت آئی۔

يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝

(سورۃ الفجر ۸۹: ۲۷-۲۸)

اے نفس مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف لوٹ آ، تو اس کی رضا کا طالب ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی۔

ضرب کلیم میں ص ۷۳۔ ۵۷۳ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔

''فقر و راہبی''

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وانمود اس کو
کہ ہے نہایت مومن خودی کی عریانی
وجود صیرفی کائنات ہے اس کا
اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی
اسی سے پوچھ کہ پیش نگاہ ہے جو کچھ
جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی
یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی

لبِ لباب اس نظم کا یہ ہے علامہ اقبال کا فقر راہبانہ زندگی گزارنے کا نام نہیں بلکہ جدوجہد کوشش و کاوش اور سعی مسلسل کا نام ہے فقیر ہمیشہ طوفان سے ٹکر لیتا ہے اس کی طبیعت میں راہبانہ سکون نہیں وہ باقی و فانی کے فرق کو سمجھتا ہے۔

مسلمانوں نے جب سے اس فقر کو خود سے جدا کر دیا، یہ فقر اُن کے پاس نہ رہا تو اب وہ دونوں طرح کی دولت سے محروم ہو گیا نہ تو اس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت جیسا جلال اور اقتدار رہا اور نہ ہی حضرت سلمان فارسی کا جمال، طمانیت، تقویٰ اور فقیرانہ زندگی رہی۔

ضربِ کلیم ۱۰۲/ ۶۰۲

میں ایک نظم ہے جس میں فقر کو نہایت خوب صورت انداز میں سمجھایا ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال درحقیقت اپنے بیٹے "جاوید" سے خطاب کر رہے ہیں۔

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز
دین و دولت، قمار بازی
ناپید ہے بندۂ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شان بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت
ہے اس کا مقام شاہبازی
روشن اس سے خرد کی آنکھیں
بے سرمۂ بوعلی و رازی

حاصل اس کا شکوہ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل
رکھتا نہیں ذوق نے نوازی
ہے اس کی نگاہ عالم آشوب
درپردہ تمام کار سازی
یہ فقر غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

علامہ اقبال اس نظم میں یہ فرمارہے ہیں کہ اگر تم میں ہمت ہو تو وہ فقر تلاش کرو جس کا سرزمین حجاز سے تعلق ہے، جس کا منبع اور سرچشمہ سرزمین حجاز ہے اگر وہ فقر تمہیں حاصل ہو گیا تو پھر تمہارے اندر خدائی صفت پیدا ہو جائے گی یعنی بے نیازی اور صمدیت۔ حکم بھی یہی ہے کہ "تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللہ" تم اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرو۔

پھر وہ فرماتے ہیں کہ یہ فقر جس کے ہاتھ لگ جائے گا تو وہ مرد غازی تیغ و سناں کا محتاج نہ ہوگا۔

پھر وہ اسباب پر بھروسا نہیں کرے گا بلکہ خالق اسباب اس کی مدد نصرت اور حمایت کرے گا جس طرح بدر و احد خیبر و خندق اور حنین میں کی تھی اور اسی کا جلوہ کربلا کے ریگ زار پر نظر آیا تھا۔

علامہ اقبال ارمغان حجاز ص ۲۱ے میں فرماتے ہیں۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

علامہ اقبال کے نزدیک فقر کی دو قسمیں ہیں: ایک خانقاہی فقر ہے جو غم و الم، حزن و محن اور دل گیری سکھاتا ہے۔ جس میں قنوطیت ہے، حرمان و یاس ہے، نا امیدی اور ناکامی ہے۔ اور دوسرا فقرِ شبیری ہے امام حسین علیہ السلام نے۔

(كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ) (سورۃ البقرہ ۲:۲۴۹)

بار ہا ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹا گروہ اللہ کے اذن سے بڑے گروہ پر غالب آ گیا") جس کی عملی تفسیر کربلا میں پیش کر دی اور دنیا کو سکھا دیا کہ باطل سے کس طرح ٹکرایا جاتا ہے، اور احیائے کلمۂ حق کے لیے کون سی تدبیر کارگر ہوتی ہے اور بقول اقبال

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

☆☆☆

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگ پور مرتضیٰ چیزی دگر

علامہ اقبال جاوید نامہ میں فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہر موت مومن کے لیے خوش گوار، شیریں، میٹھی اور اچھی ہوتی ہے یعنی مومن نہ موت سے ڈرتا ہے نہ گھبراتا ہے بلکہ استقبالِ موت کے لیے ہر وقت آمادہ اور تیار رہتا ہے۔

وہ اسی سے ملتی جلتی بات ارمغانِ حجاز میں فرماتے ہیں۔

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

میں مردِ حق کی دوسری کوئی علامت و نشانی تم سے کیا بیان کروں جب اس کی موت کا وقت آتا ہے تو وہ مسکراتا ہوا اسے قبول کر لیتا ہے۔

علامہ اقبال ہر قسم کی موت کو شکر سے تعبیر کر رہے ہیں لیکن جب امیر المومنین امام المتقین حضرت علی کے خاندان کی موت کا تذکرہ کرتے ہیں تو پھر اس موت کو دوسری چیز قرار

دیتے ہیں۔

پور مرتضیٰ سے اشارہ ہے امام حسینؑ اور ان کے اقربا اور اصحاب کی موت کی طرف، اس موت کا مقصد صرف جان، جان آفریں کے سپرد کرنا نہیں بلکہ اعلائے کلمۂ حق اور دین و آئین کی سربلندی و سرافرازی اور شریعت کی پاس داری اور تعلیمات قرآنی کی بقا اور سنت رسول کی احیاء کے لیے امام حسین علیہ السلام نے اپنے بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بیٹوں کی قربانی پیش کی ابھی ان کی طبعی موت کا وقت نہیں آیا تھا لیکن اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ہر ایک نے خوشی خوشی موت کا استقبال کیا اور موت کو گلے لگایا اور مرنے کے لیے میدان کارزار میں تشریف لے گئے۔

ز حیدریم من و تو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوران بگردانیم

(جاوید نامہ ص ۱۱۸/ ۷۰۶)

ہم اور تم دونوں کا تعلق حیدر کرار سے ہے ہمارے لیے کوئی انوکھی اور ان ہونی بات نہ ہوگی اگر ہم ڈوبتے ہوئے سورج کو مشرق کی طرف پلٹا دیں، اس شعر میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جسے ردِّ شمس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو تاریخ اسلام کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اور غزوۂ خیبر سے واپسی کے موقع پر پیش آیا تھا، اور دوسری مرتبہ معرکہ نہروان سے واپسی پر ہوا تھا۔

اس موضوع پر علماء نے جدا جدا کتابیں تحریر کی ہیں جن میں علامہ جلال الدین سیوطی سرفہرست ہیں۔

مشہور محدث طحاوی مشکلات الحدیث میں اسماء بنت عمیس سے واقعہ کو دو طریق سے روایت کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر وحی کا سلسلہ جاری تھا اور ان کا سر اقدس حضرت علی علیہ السلام کی آغوش میں تھا اور حضرت علی نے (کسی وجہ سے) عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی یہاں

تک کہ سورج غروب ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حضرت علیؑ سے سوال کیا

أَصَلَّيْتَ يَا عَلِيُّ؟ اے علی کیا تم نے نماز پڑھ لی؟

حضرت علیؑ نے جواب دیا "نہیں" تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا

اَللّٰهُمَّ اِنَّهُ كَانَ فِيْ طَاعَتِكَ وَطَاعَةِ رَسُوْلِكَ فَارْدُدْ عَلَيْهِ الشَّمْسَ

اے اللہ یہ (علیؑ) تیری اور تیرے رسول کی اطاعت کر رہے تھے تو ان کے لیے سورج کو پلٹا دے

اسماء فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ سورج غروب ہو چکا تھا وہ غروب ہو جانے کے بعد دوبارہ طلوع ہوا اور پہاڑ پر نظر آیا اور یہ "صہباء" کے مقام پر خیبر میں ہوا تھا۔

(تاریخ الخمیس ۲/ ۵۸ مشکل الآثار ۲/ ۱۱)

علامہ اقبال اس واقعہ سے یہ استفادہ کر رہے ہیں کہ اگر ہم اور تم حیدر کرار کے ماننے والے اور ان کی طاعت و فرماں برداری کرنے والے ہیں تو اگر ہم مشرق کی تقدیر کو تبدیل کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اور ہم مغرب میں ڈوب جانے والے سورج کو دوبارہ نکال سکتے ہیں، یعنی اس تہذیب و تمدن کا دوبارہ احیا کر سکتے ہیں، مسلمان پوری دنیا کے حکمران تھے، اور ہر طرف ان کی تہذیب اور ان کا تمدن نظر آتا تھا، انھی کی روایات کی پیروی کی جاتی ہے، اس وقت یورپ جہالت میں ڈوبا ہوا اور گمنامی کے پردوں میں چھپا ہوا تھا اور اسلام ہر طرف چھایا ہوا تھا، ہم اگر سعی کریں، عمل پیہم کو اپنا شعار بنائیں تو ہم مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کو دوبارہ مشرق کی طرف پلٹا سکتے ہیں۔

اسرار خودی میں ایک عنوان ہے "الوقت سیف"

پنجۂ حیدر کہ خیبر گیر بود
قوت او از ہمیں شمشیر بود

(اسرار خودی ص ۷۱/ ۸۰)

اس شعر میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ پنجۂ حیدر جس نے باب خیبر کو اکھاڑ دیا تھا ان کی

قوت وطاقت کا راز یہی شمشیر تھی۔

ان کے نزدیک وقت تلوار ہے اور اسی ذیل میں انھوں نے تمام مثالیں دی ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں متعدد مقامات پر خیبر اور اس کی فتح کا ذکر کیا ہے، یہ حضرت علی کا بہت بڑا معرکہ تھا جس نے عظمتِ علی کو اجاگر کیا ہے، اور ان کی قوت وطاقت کو عوام الناس کی نگاہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

وہ دروازہ جسے چالیس افراد مل کر بند کرتے اور کھولتے تھے حضرت علی علیہ السلام نے اپنی پانچ انگلیوں کے ذریعے اس دروازے کو اکھاڑ کر پھینک دیا، یہ علی کا ایسا کارنامہ ہے جسے کوئی فراموش نہیں کرسکتا ہے تاریخ کے صفحات پر یہ واقعہ نمایاں اور جلی حرفوں کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

علامہ اقبال کی کتاب جاوید نامہ کلیات اقبال فارسی چاپ ایران ص ۲۸۲ میں ہے۔

عشق با نانِ جویں خیبر کشاد

عشق در اندامِ مہ چاکی نہاد

اس شعر میں دو واقعات کی طرف اشارہ ہے، ایک واقعہ ہے باب خیبر کا کھل جانا، اور قلعۂ خیبر کا فتح ہونا اور دوسرا واقعہ چاند کا دو ٹکڑے ہونا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کا ایک معجزہ ہے۔

خیبر کے بارے میں اس سے پہلے ہم وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، اس شعر میں حضرت علی کو عشق سے تعبیر کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ وہ جو کی خشک روٹی کھاتے تھے اور باب خیبر کو انھوں نے اکھاڑا تھا، اور دروازہ کھول کر قلعۂ خیبر کو فتح کر لیا تھا اسی لیے انھیں فاتح خیبر کہا جاتا ہے۔

حضرت علی کی غذا میں زیادہ تر جو کی خشک روٹی ہوتی تھی جسے وہ تھیلی میں بند کرکے اور اس پر مہر لگا کر رکھا کرتے تھے۔ اسی واقعے کو علامہ اقبال نے اپنی مثنوی رموز بیخودی میں تفسیر سورۂ اخلاص کے ذیل میں ص ۱۸۳ پر اللہ الصمد کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

چوں علی در ساز با نانِ شعیر
گردنِ مرحب شکن خیبر گیر

تم حضرت علی علیہ السلام کی طرح جو کی روٹی سے سمجھوتا کرلو جو کی روٹی کھاؤ اور دنیاوی لذتوں سے اور انواع و اقسام کے طعام سے منہ موڑلو کام و دہن کی لذت وقتی مزہ ہے اور کچھ نہیں جسے جو کی روٹی مزے دار لگتی ہے پھر وہ کسی اور غذا کا طلب گار نہیں ہوتا، حضرت علی کی حیات طیبہ سے درس لو کہ انھوں نے کس طرح جو کی روٹی پر اکتفا کرلیا اور اسی کو اپنی غذا بنالیا۔

اگر تم میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو پھر تم مرحب کی گردن کو توڑ کر خیبر فتح کرسکتے ہو، جو کام حضرت علی نے انجام دیا وہ تم بھی کرسکتے ہو بشرطیکہ تم اپنے اندر وہ صفات اور وہ خوبی پیدا کرلو۔ لیکن ایسا کوئی کر نہ سکا۔

عشق در اقدامِ مہ چاکی نہاد

سے اشارہ ہے اس معجزے کی طرف مشرکین نے جس کا حضور سرور کائنات سے مطالبہ کیا تھا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا

هَلْ مِنْ آيَةٍ نَعْرِفُ بِهَا أَنَّكَ رَسُولُ اللهِ

کیا کوئی ایسی نشانی ہے جس سے یہ پتا چلایا جائے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ سے نشانی دکھانے کے لیے التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے حضور کے کہنے پر مشرکین مکہ کو دکھایا کہ جبلِ ابی قبیس پر چاند دو ٹکڑے ہوگیا، اور انھوں نے چاند کے دو حصوں کے درمیان "حرا" کو دیکھا رسول اللہ نے فرمایا تم مشاہدہ کرو۔

قریش نے یہ نشانی نہایت وضاحت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کافی دیر تک ایسا نظر آتا رہا، وہ انگشت بدنداں رہ گئے اور بڑے حیران و ششدر ہوئے لیکن ایمان نہیں لائے بلکہ کہنے لگے یہ ابن ابی کبشہ کا جادو ہے محمد نے ہم پر جادو کردیا ہے، ایک شخص نے کہا کہ اگر محمد نے تمھیں مسحور کردیا ہے تو تمام لوگوں کو تو مسحور نہیں کیا جب سفر سے کوئی واپس آئے تو اس سے دریافت کرنا جب لوگ سفر سے واپس آئے اور ان سے سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب

دیا کہ ہم نے یہ دیکھا تھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لیکن قریش پھر بھی کفر پر اڑے رہے اور اپنی خواہشات کا اتباع کرتے رہے۔ روضۃ الانوار فی سیرۃ النبی المختار ص ۱۱۸۔۱۱۹

الجامع البخاری محمد بن اسماعیل بخاری متوفی (۲۰۵) باب انشقاق القمر (۳۶)

حدیث ۳۸۶۸۔۳۸۶۹۔۳۸۷۰۔۳۸۷۱

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان اھل مکۃ سألوا رسول اللہ ان یریھم ایۃ فاراھم القمر شقتین حتی رأو حراء بینھما (حدیث ۳۸۶۸)

انس بن مالک سے روایت ہے کہ مکہ کے باشندوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی نشانی دکھانے کے لیے کہا تو انھوں نے چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھا دیا یہاں تک کہ لوگوں نے دو ٹکڑوں کے درمیان "حرا" کو دیکھا۔

نعرہ حیدر نوائے بوذر است
گرچہ از حلق بلال و قنبر است

(اسرار ورموز)

علامہ اقبال نے اس شعر میں چار ہستیوں کا تذکرہ کیا ہے، حیدر کرار، صفدر جرار، حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت ابوذر غفاری، حضرت بلال ابن رباح مؤذن رسول اللہ اور حضرت قنبر خادم مولا علی، حضرت علی کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد نے ان کا نام حیدر یا حیدرہ رکھا تھا، عربی زبان میں اس لفظ کا مفہوم شیر نیستاں ہے، حضرت علی نے مرحب کے مقابلے میں بطور رجز اس نام کا ذکر کیا ہے۔

انا الذی سمتنی أمی حیدرہ

میری ماں نے میرا نام حیدرہ رکھا ہے

دوسری شخصیت حضرت ابوذر کی ہے ان کا نام جندب بن جنادہ ہے وہ ایمان لانے والوں میں سابق ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابیوں میں سے ہیں ۳۱ ہجری یا ۳۲ھ میں ربذہ میں ان کا انتقال ہوا۔

بحار الانوار میں مجالس مفید میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایمان کے دس درجے ہیں مقداد آٹھویں، ابوذر نویں اور سلمان دسویں درجے پر فائز تھے۔

عیون اخبار الرضا میں حضرت امیر المومنین سے مروی ہے کہ زمین سات افراد کے لیے خلق کی گئی ہے انھی کے سبب رزق ملتا ہے، بارش ہوتی ہے اور ان ہی کی وجہ سے مدد کی جاتی ہے، ابوذر، سلمان، مقداد، عمار، حذیفہ اور عبداللہ بن مسعود، حضرت علی نے فرمایا: میں ان کا امام ہوں یہ وہی حضرات ہیں جنھوں نے حضرت فاطمہ زہرا کے جنازے میں شرکت کی تھی۔

بحوالہ منتخب التواریخ محمد ہاشم خراسانی ص ۳۰

حضور سرور کائنات نے حضرت ابوذر غفاری کے بارے میں فرمایا تھا۔

مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ، وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ مِنْ ذِي لَهْجَةٍ، اَصْدَقَ مِنْ اَبِي ذَرٍّ

اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچے لہجے والا کوئی نہیں ہے۔

الاستیعاب/الاصابہ ۱/۳۱۶ ۔ سنن الترمذی دار ابن حزم ص ۱۰۳۰ ح ۳۸۱۰۔۳۸۱۱

تیسری شخصیت بلال ابن رباح کی ہے انھوں نے دمشق میں وفات پائی ان کا مقبرہ باب الصغیر قبرستان میں ہے، وہ صحابی رسول اور موذن رسول تھے، رسول اللہ نے بلال اور عبیدہ بن الحارث بن المطلب کے درمیان عقد مواخات قائم کی تھی، انھوں نے نبی اکرم کے انتقال کے بعد اذان دینا موقوف کر دی۔ حضرت فاطمہ زہرا کے اصرار پر اذان دی لیکن حضرت فاطمہؑ کے غش ہوجانے کے سبب اذان نامکمل چھوڑ دی، امیہ بن خلف نے انھیں بہت زیادہ اذیت دی تھی وہ جتنی اذیت دیتے ان کی زبان سے کلمہ احد، احد جاری ہوتا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے خرید کر انھیں آزاد کر دیا تھا۔

چوتھی شخصیت حضرت قنبر کی ہے جن کا علامہ اقبال نے ذکر کیا ہے وہ حضرت علی علیہ السلام کے غلام خاص تھے، انھی کے بارے میں امیر المومنین نے فرمایا تھا۔

اِنِّي اِذَا اَبْصَرْتُ شَيْئًا مُنْكَرًا

اَوْقَدْتُ نَارِيْ وَ دَعَوْتُ قَنْبَرًا

جب میں کسی غلط بات کو دیکھتا ہوں تو آگ روشن کرکے قنبر کو آواز دیتا ہوں (کہ مجرم کو لے آؤ)

رجال کشی میں ہے کہ جب حجاج بن یوسف ثقفی نے انھیں (محبت علی کے جرم میں گرفتار کیا تھا تو ان نے پوچھا تم علی کی خدمت کس طرح کرتے تھے انھوں نے جواب دیا میں ان کے وضو کے لیے پانی لا کر دیتا تھا اس نے پوچھا علی وضو کرنے کے بعد کیا کہتے تھے قنبر نے جواب دیا وہ اس آیت کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۃ الانعام ۶: ۴۴-۴۵)

پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انھیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوش حالی کے دروازے کھول دیے جو کچھ انھیں دیا گیا تھا جب وہ اس میں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا اور اس وقت وہ مایوس ہو کر رہ گئے، اس طرح ظلم کرنے والوں کی جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا گیا اور ہر طرح کی تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنہار ہے۔

حجاج نے کہا میرا یہ گمان ہے کہ وہ اس آیت سے ہمارے بارے میں تاویل کرتے تھے، حجاج نے کہا اگر میں تمھیں قتل کر دوں تو کیا ہوگا تو قنبر نے جواب دیا ایسی حالت میں، میں سعید اور تو شقی ہوگا۔

اس نے محبت علی کے جرم میں حضرت قنبر کا سر قلم کر دیا ان کی قبر بغداد شہر میں موجود ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے شعر

نعرۂ حیدر نوائے بوذر است
گرچہ از حلق بلال و قنبر است

میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جو حیدر کرار کا نعرہ ہے وہی نعرہ ابوذر، بلال اور قنبر

کا بھی ہے چاروں کی فکر ایک ہے، خیالات ایک ہیں، نظریات اور افکار بھی ایک ہی جیسے ہیں۔

اس شعر میں دو آزاد انسانوں اور دو غلاموں کا تذکرہ ہے جنھیں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کے اسلام نے غلامی کی زنجیروں کو توڑا ہے اور رنگ ونسل اور خاندان ونژاد کے فرق کو مٹایا ہے، حریت فکر ونظر دی ہے، حضرت علی نے جو نعرہ بلند کیا ہے حق و صداقت اور عدالت ودیانت کا ایمان اور امانت کا بہادری اور شجاعت کا وہی دین اور شریعت کا نعرہ ہے وہی ابوذر کی بھی آواز ہے اور اس میں سر مو فرق نہیں ہے بلال جو موذن رسول ہیں ان کے حلق سے بھی وہی کلمۂ حق وصداقت جاری ہو رہا ہے اور قنبر بھی اسی بات کا پرچار اور اعلان کر رہے ہیں۔

لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُولَدْ کے عنوان سے علامہ اقبال نے اسرار و رموز بے خودی ص ۱۸۸ پر قنبر کے بارے میں یہ فرمایا

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمت یک اسودش صد احمر است
قطرہ آب وضوئے قنبرے
در بہا برتر ز خون قیصرے

وہ مسلمانوں سے خطاب کرتے ہیں کہ اے مسلمانو تمھاری قوم رنگ وخون اور نسل و خاندان کے فرق اور تمیز سے بالاتر ہے، ایک اسود یعنی سیاہ فام کی قیمت سو سرخ سکوں کے برابر ہے اسود سے مراد حضرت بلال ہیں جو سیاہ فام تھے۔ الاحمر عربی میں سونے اور چاندی کو کہتے ہیں یہاں پر لفظی اعتبار سے اسود کے مقابل میں احمر لائے ہیں اسلام نے غلامی کو ختم کیا اور رنگ ونسل کے فرق کو مٹایا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا آخری خطبہ اس امر کا گواہ ہے۔

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ إِلَّا بِالتَّقْوَى

کسی عربی کو کسی عجمی اور کسی سرخ (گورے) کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں

ہے سوائے تقویٰ کے۔

دوسرے شعر میں علامہ اقبال فرما رہے ہیں کہ حضرت قنبر جو حضرت علی کے غلام خاص تھے، ان کے وضو کا ایک قطرہ فضیلت، عظمت اور قیمت میں قیصر و کسریٰ کے خون سے کہیں زیادہ قیمتی اور گراں بہا ہے اس لیے کہ اگر قیصر (بادشاہ روم کا لقب) کا خوں بہایا جائے تو اس کا خوں بہا بہت زیادہ ہوگا، لیکن علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت بلال جس پانی سے وضو کر رہے ہیں ان کے وضو کا ہر قطرہ بیش بہا اور قیمتی ہے، اور اس کی قدر و قیمت قیصر کے خون سے کہیں بڑھ کر ہے، اور عظمت میں اعلیٰ بالا، بہتر اور برتر ہے۔

اسی نظم میں وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت سلمان کا بھی ذکر اس طرح کر رہے ہیں

فارغ از باب و ام و اعمام باش
ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

(مثنوی اسرار و رموز بے خودی ص ۱۸۸)

جب انسان مسلمان ہوتا ہے اور اسلام کو قبول کرتا ہے تو اسے اپنے خاندان اور آب وجد کو چھوڑنا پڑتا ہے سب سے رشتہ ناتا توڑنا پڑتا ہے لا کہہ کر الا کی سرحد میں قدم رکھنا ہوتا ہے۔

اور تم سلمان کی طرح اسلام کے فرزند بن کر آب وجد سے رشتہ توڑ لو، اور سلمان کی طرح اسلام کے فرزند بن جاؤ۔

سلمان فارسی رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے خاص الخاص اصحاب میں سے تھے۔ انھوں نے مدینۂ منورہ میں آنحضرت کی زیارت کی وہ ایمان کے دس درجہ پر فائز تھے اور السلمان منا اہل البیت کی بنیاد پر اہل بیت کے ایک فرد شمار کیے جاتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں اَدْرَكَ سَلْمَانُ الْعِلْمَ الْاَوَّلَ وَالْعِلْمَ الْاٰخِرَ وَهُوَ بَحْرٌ لَا يَنْزَحُ وَهُوَ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ

سلمان کو علم اول اور علم آخر ملا ہے وہ ایسا سمندر ہے جو ختم نہیں ہوتا اور اس کا ہم اہل بیت سے تعلق ہے۔

سدیر صیرفی امام محمد باقر سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت ایک ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور ہر ایک اپنا حسب اور نسب بیان کر کے اس پر فخر و مباہات کر رہا تھا، سلمان بھی ان کے درمیان تشریف رکھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سلمان کی طرف رخ کیا اور ان سے دریافت کیا کہ اے سلمان تمہارا حسب نسب کیا ہے؟ تو سلمان نے جواب دیا۔

أَنَا سَلْمَانُ بْنُ عَبْدِ اللهِ كُنْتُ ضَالًّا فَهَدَانِي اللهُ بِمُحَمَّدٍ وَكُنْتُ عَائِلًا فَأَغْنَانِي اللهُ بِمُحَمَّدٍ وَكُنْتُ مَمْلُوكًا فَأَعْتَقَنِي اللهُ تَعَالَى بِمُحَمَّدٍ فَهٰذَا حَسَبِي وَنَسَبِي يَا عُمَرُ

میں سلمان بن عبداللہ ہوں میں حیران و شش و پنج میں تھا (راستا گم کر چکا تھا) اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذریعے میری ہدایت کا سامان فراہم کیا، میں محتاج تھا مجھے حضرت محمد کے وسیلے سے غنی کر دیا میں غلام تھا حضرت محمد کی وساطت سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے آزاد کر دیا اے عمر یہ میرا حسب اور نسب ہے۔

حضرت سلمان فارسی سے جب ان کے والد کا نام دریافت کیا جاتا تو وہ فرماتے تھے، **أَنَا سَلْمَانُ ابْنُ الْإِسْلَامِ** میں سلمان فرزندِ اسلام ہوں۔

علامہ اقبال شعر ماسبق میں فرماتے ہیں تم ماں باپ اور چچاؤں کے افتخار و شرف سے فارغ ہو جاؤ اسے تج دو، اس پر افتخار نہ کرو، حسب و نسب کی اسلام میں چنداں اہمیت نہیں ہے تم کو چاہیے کہ حضرت سلمان کی پیروی کرتے ہوئے خود کو اسلام کا فرزند بنا دو اس لیے اسلام کے نزدیک فضیلت اور عظمت کا معیار خاندان قبیلہ اور عشیرہ نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

اور **إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ** اس پر گواہ ہے۔

علامہ اقبال حضرت سلمان فارسی کے بارے میں اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

جو پیام مشرق کلیات اشعار فارسی ص ۱۹۲ کی زینت ہے۔

آن مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند
مثل سلمان در مدائن بودہ اند

وہ مسلمان جنھوں نے امارت کا عہدہ سنبھالا ہے وہ اگر حقیقی معنی میں اسلام کے پیروکار ہیں اور اسلام پر عمل کرتے رہے تو ان کی امارت، سلطنت و بادشاہت قائم کرنے اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ وہ شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی فقیری کر رہے تھے ان کی شہنشاہی میں فقیری اور درویشی عیاں تھی، وہ ایسے افراد تھے جنھوں نے اپنی امارت و حکومت میں فقر کو شامل کر لیا تھا وہ عنانِ حکومت سنبھال لینے کے بعد مطلق العنان حکمران نہیں بنے تھے بلکہ وہ خود کو ایک خدمت گزار اور ذمہ دار سمجھتے تھے ان کے رہن سہن سے ان کے بود و باش سے امارت و سلطنت کی بو نہیں آتی تھی وہ درویش صفت لوگ تھے اگر تم مثال دیکھنا چاہتے ہو تو سلمان فارسی کو دیکھ لو وہ مدائن میں گورنر تھے لیکن دارالامارہ میں رہنے کی بجائے وہ مسجد میں مقیم تھے زمین پر سوتے تھے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔

حکمرانی بود و سامانی نداشت
دست او جز تیغ و قرآنی نداشت

(پیامِ مشرق)

حضرت سلمان حاکم تھے، مدائن کے گورنر تھے ان کا انتظامِ حکومت نہایت عمدہ تھا لیکن ان کے پاس عیش و عشرت کا کوئی سامان نہ تھا وہ ظاہری شان و شوکت کے خلاف تھے، سادگی ان کا شعار تھا ان کے قبضے میں صرف دو چیزیں تھیں ایک تلوار جو ایک بہادر کا زیور ہے اور دوسرے قرآن مجید جس کے احکام کو وہ مدائن میں نافذ کر رہے تھے جو آئین تھا جو دستور تھا جو قانون تھا۔

اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست

بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

(پیام مشرق)

جس شخص کے پاس عشق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا قیمتی سرمایہ موجود ہے تو پھر اسے کسی چیز کی پروا نہیں ہے وہ اس عشق کی بنیاد پر بحر و بر کو اپنا مطیع و منقاد بنا سکتا ہے اور پوری کائنات اس کے زیر نگیں ہو سکتی ہے جو عاشق رسول ہے وہ عالمین پر حکومت کر سکتا ہے بشرطیکہ عشق سچا ہو۔

اسی بات کو علامہ اقبال نے دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

(بانگ درا)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے وفاداری کے سبب نہ صرف یہ کہ اللہ اس کا ہو جاتا ہے اسے خدا مل جاتا ہے بلکہ لوح و قلم سب کچھ اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے وہ قضا و قدر پر اقتدار حاصل کر لیتا ہے، دنیا و مافیہا کی تو اس کے سامنے کوئی حقیقت اور اصلیت باقی نہیں رہتی

حضرت ابوذر غفاری کے لیے فرماتے ہیں۔

چوں ابوذر خود گداز اندر نماز

ضربتش ہنگام کیں خارا گداز

تم حضرت ابوذر کی طرح خود کو نماز میں مکمل طور سے اللہ کے سپرد کر دو جس طرح حضرت ابوذر جب عبادت کرتے تھے اور نماز میں مصروف ہوتے تھے تو انھیں دنیا و مافیہا کا بالکل ہوش نہیں رہتا تھا وہ خود کو اللہ کی بارگاہ میں محسوس کرتے تھے اور خود سپردگی کا عالم ان کی نماز میں ہوا کرتا تھا حضرت ابوذر کو جو لہجے کی صداقت ملی اور ایمان کی طاقت ملی تو اس کا سبب ان کی یہ عبادت تھی جب وہ محراب عبادت میں ہوتے تھے تو بدن کانپتا تھا وہ لرزہ براندام ہوتے تھے ایسا محسوس ہوتا

تھا جیسے زندگی کی رمق باقی نہیں ہے لیکن وہی ابوذر جب میدان حرب و ضرب میں آتے تھے تو ان کی ضربت سنگ خارا کو بھی موم بنا دیتی تھی، ان کی ضربت کی کاٹ زبردست تھی ان کی تلوار حق کے لیے نیام سے نکلی تھی اور ہمیشہ اعلائے کلمۂ حق کے لیے انھوں نے تلوار اٹھائی تھی۔

علامہ اقبال عالم اسلام کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اگر تم سچے مسلمان بننا چاہتے ہو اگر تم عبدِ خدا کی منزل پر فائز ہونا چاہتے ہو اگر تم بندگی کی اعلیٰ اقدار کو اپنانا چاہتے ہو تو حضرت ابوذر کی طرح نماز میں خود کو ایسا گم کر دو کہ من و تو کا فرق مٹ جائے تم نماز میں خداوند عالم سے ہم کلام ہو کر "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کہتے ہو لہٰذا تم حضرت ابوذر کی طرح اقامتِ صلوٰۃ کرو اور ان کے اسوۂ حسنہ کو اپناؤ، اور جب میدان جنگ اور حرب و ضرب ہو تو تمھاری تلوار خاراشگن بن جائے جیسا کہ علامہ اقبال اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

☆☆☆

علامہ اقبال کے فارسی اور اردو کے کلام میں جا بجا مختلف مقامات پر خیبر، حیدر، مرحب، عنتر، زورِ بازو، حیدریم، نانِ شعیر، نانے از جو، کرار، مئی کراری، درِ خیبر، اسد اللّٰہی، قوتِ حیدری، شمشیرِ علی، شیرِ خدا، خیبر کشا، یہ تمام الفاظ استعمال ہوئے ہیں ہم ذیل میں ان تمام اشعار کی تشریح کر رہے ہیں، جن میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

پیش او گردوں یکے خیبر است
ضربتِ او از مقام حیدر است

(جاوید نامہ ۳۱۹)

اس کے سامنے تو آسمان تو خیبر کی طرح ہیں، اور اس کی ضربت کا تعلق مقام حیدر سے ہے۔

علامہ اقبال کی کتاب جاوید نامہ، مولانا جلال الدین رومی کی روح سے ملاقات اور زروانی جو روح زمان و مکان ہے وہ مسافر کو عالم علوی کی سیاحت کے لیے لے کر جاتا ہے وہ

پہلے فلک قمر پر جاتے ہیں وہاں سے فلک عطارد پر پہنچتے ہیں اور اس کا مشاہدہ کرنے کے بعد فلک زہرہ تک آتے ہیں اس شعر کا تعلق اسی حصے سے ہے جو فلک زہرہ سے تعلق رکھتا ہے۔

نہ آسمان سے مراد یہ نو آسمان ہیں، قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مریخ، مشتری، زحل، فلک اطلس یا ثوابت اور فلک الافلاک اور نو خیبر سے مراد خیبر کے نو قلعے ہیں جن کے نام یہ ہے، ناعم، قموص، قلعہ کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، قلعہ مصعب بن معاذ، وطیح، سلالم، شق نطاۃ، کتیبہ

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراک او سلطان و میر

(مثنوی پس چہ باید کرد)

خیبر گیر، خیبر کے قلعے پر قبضہ کرنے والے علی المرتضیٰ کے فقر کا تعلق جو کی روٹی سے ہے ان کی غذا سادہ تھی وہ جو کی روٹی کھاتے تھے اور قوت حیدری کے مالک تھے ان کے شکار بند (فتراک) سے کیا بادشاہ کیا امیر سب بندھے ہوئے ہیں فتراک اس بند کو کہا جاتا ہے جو زین سے بندھا ہوتا ہے حضرت علی غالب علی کل غالب ہیں۔

خیبر از مردان حق بیگانہ نیست
در دل او صد ہزار افسانہ نیست

(مثنوی)

خیبر کا قلعہ مردان حق سے بیگانہ نہیں ہے اس کے دل میں لاکھوں افسانے نہیں ہیں، قلعہ خیبر جانتا ہے کہ کون حق سے وابستہ ہے کون سچ اور حق کا نمائندہ ہے کس کی بات درست اور صحیح ہے کون دنیا دار ہے اور کون دین دار ہے اس کا دل مختلف افسانوں سے آزاد ہے۔

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا در خیبر کو کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا، اس کو کیا سر کس نے؟

علامہ اقبال نے یہ شعر بانگ درا کی ایک نظم شکوہ میں بیان کیا ہے جس میں وہ اللہ سے مخاطب ہو کر شکوہ کر رہے ہیں کہ اے اللہ تو ہی بتا دے کہ جس نے در خیبر کو اکھاڑا تھا اور قلعہ

خیبر کو فتح کیا تھا وہ کون تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے قیصر کے شہر کو فتح کیا تھا؟ علامہ اقبال مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بیان کر رہے ہیں کہ کبھی مسلمانوں کی یہ کیفیت تھی کہ وہ پوری دنیا پر حکومت کر رہے تھے جس طرف رخ کرتے کامیابی اور کامرانی ان کے قدم چومتی تھی وہ ہر جگہ حق و صداقت کا پرچم لہراتے تھے اور وہ بڑی سے بڑی قوت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی، وہی عنتری

یہ شعر بانگ درا ص ۲۶۴/۲۸۰ پر ہے نظم کا عنوان ہے"میں اور تو"

علامہ اقبال شہ عرب و عجم حضور سرور کائنات سے کرم کی بھیک مانگ رہے ہیں، کہ اے میرے رب مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ دنیا ویسی ہی ہے ویسا ہی میدان کارزار ہے حریفِ پنجہ شکن بھی نئے نہیں ہیں اور انسانوں میں حضرت علی یعنی اسد اللّٰہی کی فطرت یعنی شجاعت، ہمت، جرأت اور بسالت موجود ہے، ویسی ہی مرحبی اور عنتری بھی ہے یعنی جس طرح حضرت علی کے دور میں مرحب و عنتر ان کے مقابل جنگ آزما ہوئے تھے حضرت علی نے مرحب و عنتر کو قتل کیا تھا اسی طرح حیدری جذبہ رکھنے والوں اور اسد اللّٰہی فطرت کے حامل افراد کو ایسی قوت و طاقت عطا فرما جو وہ اپنے دور کے مرحب و عنتر کو شکست دے دیں، مرحب و عنتر دو یہودی پہلوان تھے جنھیں حضرت علی نے تہ تیغ کیا تھا۔

اسی نظم کا دوسرا شعر ہے۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

اے انسان اگر تجھ میں حرارت ایمانی موجود ہے تجھ میں ایمان و ایقان کی گرمی ہے جذبۂ کامل موجود ہے اگر چنگاری بھڑک رہی ہے تو پھر فقر و غنا کا خیال نہ کر دولت مندی اور غربت سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر تو تاریخ کا مطالعہ کرے گا تو تجھ کو دکھائی دے گا کہ حضرت

علی المرتضیٰ کی قوت وطاقت جو قوت حیدری کہلاتی ہے اس کا دارومدار مرغن کھانوں اور انواع واقسام کی غذاؤں پر منحصر نہ تھا بلکہ وہ جو کی روٹی کھاتے تھے اور اسی پر ان کی قوت کا دارومدار اور انحصار تھا۔

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

(بال جبریل ۹/۳۰۱)

علامہ اقبال دعا کر رہے ہیں التجا کر رہے ہیں اے خدائے ذوالجلال اے رب متعال تو دلوں کو مہر ومحبت اور وفا کا مرکز بنادے اور اس دل کو حریم کبریا سے آشنا اور شناسا کردے۔ اور جس شخص کو تو نے جو کی روٹی کھانے کے لیے دی ہے تو پھر اس روٹی کو توڑنے کے لیے بازوئے حیدر بھی درکار ہے، وہ بھی اسے عطا کردے۔

یعنی اگر غربت وافلاس ہو تو پھر اسی اعتبار سے جینے کا سلیقہ اور قرینہ بھی عطا کردے اس لیے زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے اور بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے، اسداللہ خاں غالب فرماتے ہیں۔

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی، نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

(دیوان غالب)

☆☆☆

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(بال جبریل ۳۸۶_۴۲)

دارا اور سکندر دونوں ایران کے بادشاہ گزرے ہیں جو یقیناً نہایت دولت مند اور ثروت

مند تھے علامہ اقبال تقابل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دارا وسکندر بادشاہ تھے صاحب جلال و جبروت تھے مگر میرے نزدیک ان دونوں سے بہتر وہ فقیر شخص ہے جس کی فقیری میں اسد اللہی یعنی علی المرتضیٰ کی خوش بو رچی بسی ہو۔

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرّار بھی ہے؟

(بالِ جبریل)

علامہ اقبال نے اکثر مسلمانوں کے عروج وزوال پر گفتگو کی ہے اور دین اور وطن کے بارے میں اپنے نظریات اور خیالات اپنے اشعار کے ذریعے واضح کیے ہیں وہ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ دین اور وطن کا معرکہ خیبر سے بڑھ کر ہے بہت سے لوگ یہ نعرہ لگا رہے تھے کہ

ملّت از وطن است

ملّت کا تعلق وطن سے ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ع

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ حسین احمد مدنی سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

منبر پر تم یہ ترانہ پڑھ رہے ہو کہ ملّت کا تعلق وطن سے ہوتا ہے تم حضرت محمد عربی کے مقام ومنزلت سے کتنے بے خبر ہو انھوں نے وطن، رنگ، نسل، خاندان، عشیرہ اور قبیلہ کی تقسیم کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ کو قرار دیا تھا، ان کے نزدیک صُہیب رومی، بلال حبشی، سلمان فارسی دیگر جلیل القدر صحابہ سے افضل قرار پائے ہیں۔

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

(بالِ جبریل ص ۱۲۳-۱۲۳)

حکومت، ولایت اور حاکمیت کیا اگر تمھیں خسرو پرویز جو ایران جیسی سلطنت کا بادشاہ تھا ویسی خسروی اور بادشاہت بھی مل جائے تو اس کا کیا فائدہ ہے، اور اس سے تمھیں کیا مل جائے گا اور کیا حاصل ہوگا۔

اس لیے کہ تم دو (۲) صفات سے عاری ہو نہ تو تم میں حیدری طاقت وقوت اور ہمت و جرأت ہے اور نہ ہی تمھارے اندر حضرت سلمان فارسی جیسا استغنا اور بے نیازی ہے۔

علامہ اقبال نے دو عظیم ہستیوں کی دو صفتیں اور دو خوبیاں بیان کر کے اُمتِ مُسلمہ کو اس جانب متوجہ کیا ہے کہ اگر تمھارے اندر حضرت علی کی بہادری اور حضرت سلمان فارسی کا استغنا پیدا ہو جائے تو تم ایک کامیاب فرد بن سکتے ہو اور کامیابی تمھارے قدم چوم سکتی ہے۔

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

(ضرب کلیم ۶۸۲/۱۸۳)

خداوند عالم نے اس قوم کو سلطانی جاہ وجلال سے نوازا ہے اور شوکت و حشمت عطا کیا ہے کہ جس کے فقر میں حیدری اور کراری ہو۔ فقر، فاقہ اور احتیاج کا نام نہیں بلکہ فقر درحقیقت باعث فخر اور موجب شرف ہے، اسی لیے علامہ اقبال فقر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

(بال جبریل ص ۱۹۰ عنوان فقر)

حیدری سے مراد حیدر صفدر حضرت علی مرتضیٰ کے کردار کو اپنانا اور کرار سے مراد دشمنوں پر بڑھ بڑھ کر حملہ کرنا۔

لاعطین الرایة غدا رجلا یفتح اللہ علی یدیہ (۳۰۷۰۱-۳۰۲ بخاری شریف)

میں ضرور بالضرور کل اس شخص کو پرچم عطا کروں گا اللہ جس کے دونوں ہاتھوں پر فتح و

کامرانی عطا کرے گا۔

وسمعه يَقُوْلُ يوم خيبر لاعطين الراية رجلاً يحب الله ورسوله ويحبه الله ورسوله (صحیح مسلم ۲۴۰۴/۳۲)

اور میں نے سنا ہے کہ آنحضرتؐ خیبر والے دن یہ فرما رہے تھے کہ میں ضرور بالضرور پرچم اسے عطا کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول بھی اس سے محبت کرتے ہوں گے۔

دوسری روایت میں ہے صحیح مسلم حدیث ۲۴۰۵ (۳۳)

عن ابی هريرة ان رسول الله قال يوم خيبر لاعطين هٰذِهِ الرَّاية رَجُلاً رجلاً يحب الله ورسوله يفتح الله على يديه قال عمر بن الخطاب ما اَحْبَبْتُ الامارة الا يومئذ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا تھا بروز خیبر کہ میں ضرور بالضرور پرچم عطا کروں گا اس شخص کو جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ (تعالیٰ) اس کے دونوں ہاتھوں پر فتح عطا کرے گا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سوائے اس روز کے میں نے کبھی امارت کو پسند نہیں کیا۔

بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی

(ضرب کلیم)

اگر انسان میں جرأت و ہمت کا فقدان ہے تو پھر اس کا عشق حقیقی عشق نہیں ہے بلکہ وہ فریب ہے مکر ہے، دھوکا ہے، سراب ہے، روباہ کہتے ہیں لومڑی کو جس کا کام مکاری اور دسیسہ کاری اور رنگ بدلنا ہے، دوسرے مصرعے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر مومن میں قوت و طاقت ہے، جرأت و ہمت ہے شجاعت و شہامت ہے اس کا بازو قوی ہے اس کے بازوؤں میں

دم خم ہے تو پھر اسے عشق ید اللٰہی کا نام دیا جاسکتا ہے، ید اللہ سے مولا علی خیبر شکن مراد ہیں اور علامہ اقبال نے جابجا اس صفت کا تذکرہ کیا ہے:

مرسل حق کرد نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در ام الکتاب

(اسرار و رموز بسر اسمائے علی)

امیر قافلہ ای سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلۂ ما حیدری ز کراری است

(زبور عجم ۱۱۸)

تم قافلہ کے امیر ہو سخت کوشی کرو اور مسلسل کوشش کرتے رہو، جد وجہد اور کوشش و کاوش کو اپنا شعار بناؤ سعی پیہم کے ذریعے تم منزل مقصود تک رسائی حاصل کرسکو گے، ہمارے قبیلے میں حیدری جو مولائے مرتضٰی کی بہادری اور دلیری کا نشان اور علامت ہے وہ کراری کی وجہ سے ہے کرار کے لفظی معنی ہیں پلٹ پلٹ کر حملہ کرنے والا، اسی لیے حضرت علی کو حیدر کرار کہتے ہیں۔

بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے غزوہ خیبر کے موقع پر یہ بھی فرمایا تھا

لاعطین الرّایۃ غدًا رجلا کرارا غیر فرار یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ و رَسُوْلُہ تاریخ الخمیس الجزو الثانی ص ۵۳ بخاری حدیث ۳۷۰۱۔

میں ضرور بالضرور کل علم اس شخص کو دوں گا جو مرد ہوگا، جو پلٹ پلٹ کر حملہ کرنے والا ہوگا اور راہ فرار اختیار کرنے والا نہ ہوگا وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول بھی اس سے محبت کرتے ہوں گے۔

می شناسی معنی کرار چیست؟
ایں مقامے از مقامات علی است

کیا تم جانتے ہو، تمھیں پتا ہے کہ کرّار کا مفہوم کیا ہے؟ یہ تو مولائے کائنات علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں کرّار کے مفہوم کو سمجھایا ہے اور اس طرح حضرت علی علیہ السلام کا تعارف کرایا ہے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ لفظ کرّار عربی لغت میں پلٹ پلٹ کر حملہ کرنے والے کو کہتے ہیں امرؤالقیس جو عربی زبان کا مشہور شاعر ہے اور اس کا لامیہ قصیدہ "سبعۂ معلقات" میں سے ایک ہے، اس میں وہ گھوڑے کی اس طرح تعریف کرتا ہے

مِكَرٍّ مِفَرٍّ مُقْبِلٍ مُدْبِرٍ مَعًا

كَجُلْمُودِ صَخْرٍ حَطَّهُ السَّيْلُ مِنْ عَلِ

مِكَرٍّ: یعنی پلٹ پلٹ کر آنے والا

علامہ اقبال کراری کو ایک صفت کے طور پر دیکھتے ہیں اور حیدر کرار کے ساتھ کرّار جو نام کا جزو بن گیا ہے اس کی وضاحت کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ یہ مقام اور یہ عظمت کسی اور کے حصے میں نہیں آئی ہے وہ تو بس علی کا مقدر ہے اس کے بعد وہ فرماتے ہیں۔

امتاں را در جہاں بے ثبات

نیست ممکن جز بکراری حیات

اس ناپائیدار دنیا اور اس زوال پذیر عالم میں اُمتوں اور اقوام کے لیے زندہ و سلامت رہنا اور منزل زیست سے گزرنا، حیات کے وسیع سمندر کو عبور کرنا تلاطم اور اَمواج کا مقابلہ کرنا کشتی حیات کو پار لگانا، زندگی کے بیڑے کو سلامتی کے ساتھ ساحل تک پہنچانا کراری کے بغیر ممکن نہیں ہے، یعنی اَمواجِ بلا اور طوفانِ نامساعد کا مقابلہ کرنے کے لیے کراری کی ضرورت ہے، جب تک تمھارے اندر یہ ہمت، جرأت، اور قوت و طاقت پیدا نہیں ہوتی تم آشوب زمانہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور نہ ہی سفینۂ حیات کو ساحل مراد تک پہنچا سکتے ہو۔

تا زکراری نصیبی داشتند

در جہاں دیگر علم افراشتند

جب تک مسلمانوں کے پاس کراری کا جوہر موجود تھا اور وہ حیدر کرار کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا تھے، اسی جرأت و ہمت کے ساتھ قدم آگے بڑھا رہے تھے دشمنوں سے مردانہ وار مقابلے کر رہے تھے، تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبراتے ہوئے، طوفان کا مقابلہ کر رہے تھے، تو چاردانگ عالم میں ان کا بول بالا تھا، ان کا پرچم بلند تھا اور ہر طرف لہرا رہا تھا، وہ مسندِ علم و حکمت پر براجمان تھے، دنیا میں ان کا طوطی بولتا تھا، وہ ہر میدان میں آگے آگے تھے جب کہ یورپ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، اور ہر سمت جہالت اور گمراہی کی ظلمت چھائی ہوئی تھی تو اس وقت کراری کی وجہ سے مسلمان افقِ کائنات پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے تھے اور یہ اقوامِ عالم کے لیے مرجع و ماویٰ بنے ہوئے تھے، ساری دنیا انھی کے دسترخوان سے فیض پا رہی تھی اور اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔

مسلمِ ہندی چرا میداں گذاشت؟
ہمتِ او بوئے کراری نداشت

ہندوستان کے رہنے والے مسلمان نے کیوں میدان سے راہِ فرار اختیار کر لی، اس نے میدان کیوں چھوڑ دیا، وہ ترقی کی دوڑ میں کیوں پیچھے رہ گیا؟ وہ جہالت کے اندھیروں میں کیوں ڈوب گیا؟ اس نے علم و حکمت سے کیوں رشتہ توڑ لیا؟ اس کی تنزلی اور بے سروسامانی کا سبب کیا تھا، وہ کیوں اسفل سافلین میں چلا گیا؟ اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے وجود میں کراری کی خوش بو باقی نہیں رہی تھی، اگر اس میں کراری ہوتی تو ہمت و جرأت سے کام لیتا وہ حیدری صفت کو اپناتا اور اُسے اپنے لیے حرزِ جاں بناتا تو کبھی بھی وہ میدان سے راہِ فرار اختیار نہ کرتا، وہ میدان میں ڈٹا رہتا اور تمام دشمنوں کو مار بھگاتا اور کامیابی کے جھنڈے اسی طرح گاڑ دیتا جس طرح حضرت علی علیہ السلام نے خیبر کو فتح کر کے کامیابی کا پرچم لہرا دیا تھا۔

خیبر از مردانِ حق بیگانہ نیست
در دلِ او صد ہزار افسانہ نیست

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ خیبر حق والوں سے، حق پر عمل کرنے والوں سے، برحق افراد

سے بیگانہ اور اجنبی نہیں ہے، اگر تم اس سے دریافت کرو گے تو اس کے دل میں سینکڑوں افسانے اور داستانیں موجود ہیں، جنھیں وہ تم کو سنائے گا تم کو ان داستانوں سے آگاہ کرے گا۔

علامہ اقبال خیبر کے ساتھ مرد حق کا ذکر کر رہے ہیں اس لیے کہ فاتح خیبر وہ شخص تھا وہ ہستی تھی جس کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا تھا "علی مع الحق والحق مع علی" علی حق کے ساتھ ہیں اور حق علی کے ساتھ ہے۔ اور امام رازی اپنی تفسیر کبیر جلد اول میں فرماتے ہیں:

مَنِ اقْتَدٰى فِيْ دِيْنِهِ بِعَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَدِ اهْتَدٰى وَالدَّلِيْلُ عَلَيْهِ قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَللّٰهُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَ عَلِيٍّ حَيْثُ دَارَ

جو بھی اپنے دین میں علی ابن ابی طالب کی اقتدا کرے گا وہ ہدایت پا جائے گا اور اس پر نبی اکرم کا یہ قول دلیل ہے یا اللہ تو حق کو ادھر پھیر دے جدھر علی جائیں۔

(تفسیر کبیر امام رازی ج اول ص ۲۰۵)

علامہ اقبال نے خیبر کو ایک حقیقت قرار دے کر اسے معرفت کا نشان قرار دیا ہے کہ خیبر کو علم ہے وہ جانتا اور پہچانتا ہے کہ مردان حق کون لوگ ہیں، خیبر اُن سے نا آشنا اور ناواقف نہیں ہے۔ اور اگر تم اس سے سوال کرو گے تو وہ تمھیں ایسی سینکڑوں داستانیں اور حکایات سنائے گا جو اس کے سینے میں دفن ہیں اور اس نے ابھی تک کسی کو نہیں بتائی ہیں

اگر شایان نیم تیغ علی را
نگاہی دہ چو شمشیر علی تیز

(ارمغان حجاز)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ:

اگر میں تیغ علی کو لینے کے لائق نہیں ہوں اگر ذوالفقار حضرت علی کو اٹھانا میرے بس میں نہیں ہے، میں اس لائق اور اس قابل نہیں ہوں کہ میں تیغ علی کو اٹھاؤں تو اے خدا پھر مجھے ایسی نظر عطا کر دے جو شمشیر علی کی طرح تیز ہو۔

غزوۂ اُحد میں حضرت علی علیہ السلام نے ایسی گھمسان کی جنگ کی کہ ان کی تلوار ٹوٹ گئی تو حضور سرور کائنات نے انھیں ذوالفقار نامی تلوار عطا کردی جس سے علی نے جنگوں میں کامیابی حاصل کی کہتے ہیں کہ غیب سے ایک آواز آئی تھی۔

لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَارْ وَلَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیْ

ذوالفقار جیسی کوئی تلوار نہیں، علی جیسا کوئی جوان نہیں۔

مثل مشہور ہے تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیے تو اسی طرح ایسی بھاری بھرکم تلوار جو نہایت وزنی اور چوڑی تھی اس کا اٹھانا کسی اور کے بس میں نہ تھا، اسے صرف اور صرف حضرت علی ہی اٹھا سکتے تھے اور اس سے دشمنوں پر وار کرسکتے تھے اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ جب بھی کسی دشمن پر وار کرتی تو اس کے برابر کے دو ٹکڑے کردیتی تھی، یعنی عدل کرتی تھی، ذوالفقار حیدری کے لیے زور حیدری اور کراری درکار ہے ہر کس وناکس کے بس میں نہ اس کا اٹھانا ہے اور نہ ہی اس کا چلانا ہے۔

اس شعر میں یہ التجا کی جارہی ہے کہ اگر میں اس لائق نہیں ہوں کہ ذوالفقار حیدر کو سنبھال سکوں تو بھی اے اللہ تو مجھے ایسی نگاہ بےاس اور نظر قاطع عطا فرما کہ جو حضرت علی کی تلوار کی طرح تیز اور طرار ہو۔

روزگار او تہی از واردات
از قبور کہنہ می جوید حیات
با وطن پیوست واز خود درگذشت
دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت

(جاوید نامہ ۳۶۸)

علامہ اقبال ان اشعار میں فرماتے ہیں کہ آج کے دور کا مسلمان وہ ہے جس کی زندگی آرام اور عیش وعشرت کی نذر ہوچکی ہے وہ میدان عمل میں بالکل پیچھے ہے وہ کام کاج سے جی چراتا ہے اس کی زندگی عمل سے خالی ہے وہ پرانی قبروں سے زندگی کی رمق ڈھونڈھ رہا ہے، اس

کا انداز فرسودہ اور اس کا طریقہ واردات کہنہ ہے اس میں جدیدیت اور جدّت نہیں ہے وہ شخص اپنے وطن سے منسلک ہو چکا ہے اور ملّت کو وطن سے جوڑے ہوئے ہے اس کا یہی نعرہ ہے کہ "ملّت از وطن است" قوم وطن سے بنتی ہے جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ وطن قوم سے بنتا ہے، مسلمانوں کا وطن زمین کا ہر حصہ اور ہر گوشہ ہے یہ اور بات ہے کہ دنیا والوں نے حدود و قیود لگا رکھی ہیں اور ان پر قبضہ جما رکھا ہے علامہ اقبال نے دوسرے شعر میں دو کردار پیش کیے ہیں ایک رستم کا کردار ہے جو شاہنامہ، فردوسی کا شاہکار کردار ہے وہ رستم جو بہادری کی علامت تھا رستم و سہراب کی داستاں فارسی زبان وادب میں شہرت کی حامل ہے اور دوسرا کردار حضرت علی بن ابی طالب کا ہے جو اسلام کی جرأت وہمت اور شجاعت و بسالت کا آئینہ دار ہے، آج کے مسلمان نے رستم کو اپنا محبوب بنا لیا ہے اور "حیدر" یعنی حضرت علی بن ابی طالب کے اسوۂ حسنہ اور کردار سے دور ہو گیا ہے۔

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

(بال جبریل ۸۳)

یہ نہایت خوب صورت رباعی ہے اس کے چاروں مصرعوں میں چار لفظیں نہایت چابک دستی سے استعمال کی گئی ہیں، جمال، جلال، کمال اور زوال اور ہر لفظ کا تعلق عشق و مستی سے جوڑا گیا ہے۔

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر تم عشق و مستی اور محبت و سرخوشی کا جمال دیکھنا چاہتے ہو تو تمھیں نے نوازی میں نظر آئے گا، نے کہتے ہیں بانسری کو اور نے نوازی بانسری بجانا اور اس سے نغمہ الاپنا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ھا شکایت می کند

بانسری سے سنو کہ کس طرح اپنی داستان بیان کر رہی ہے وہ جدائی اور فراق کی شکایت کر رہی ہے۔

کز نیستاں چوں مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

جب مجھے نیستان (بانس کا کھیت) سے کاٹ کر لایا گیا اور مجھ سے بانسری بنائی گئی اور اس سے سُر نکلنے لگے تو اسے سن کر مرد اور عورتیں سب نے گریہ کیا علامہ فرماتے ہیں کہ اگر عشق و مستی کا جلالی مشاہدہ کرنا چاہتے ہو تو پھر اس کی بے نیازی کو دیکھو کہ وہ دنیا و مافیا سے بے نیاز ہے استغنٰی کی سی کیفیت ہے، اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی وہ عشق کے جلال میں مگن ہے اور مستی کی سرخوشی اس پر طاری ہے۔

اور اگر تم عشق و مستی کو منزل کمال پر دیکھنا چاہتے ہو تو پھر تمھیں مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کے دروازے پر آنا ہوگا تمھیں یہ کمال ظرف حیدر میں نظر آئے گا جن کی ذات والا صفات تضادات کا مجموعہ ہے اور ان کی ہستی میں متضاد صفتیں نظر آتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت علی علیہ السلام کی متضاد صفات کو بیان کیا جسے صفی الدین حلی نے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔

جُمِعَتْ فِي صِفَاتِكَ الاضداد
فَلِهٰذَا عَزَّتْ لَكَ الْاَنْدَادُ
زَاهِدٌ حَاكِمٌ حَلِيمٌ شُجَاعٌ
نَاسِك فَاتِكٌ فَقِيْرٌ جَوَاد
شِيَمٌ مَا جُمِعْنَ فِي بَشَرٍ قَطُّ
وَلَاحَازَ مِثْلَهُنَّ الْعِبَاد

خُلُقٌ يُخْجِلُ النَّسِيْمَ مِنَ اللُّطْفِ
وَبَأْسٌ يَذُوْبُ مِنْهُ الْجَمَادُ

☆☆☆☆

اے وہ ہستی جس کی ذات میں متضاد صفات جمع ہیں
اسی وجہ سے آپ کا مدِ مقابل ملنا دشوار ہے
دنیا سے بے رغبت ہے اور حاکم ہے
بردبار ہے اور بہادر ہے
زاہد و عابد ہے دلیر اور جری ہے
درویش اور سخی ہے
اتنی خصلتیں کسی بھی انسان میں یکجا نہیں ہوئیں
اور نہ ہی کوئی بندہ ان خصلتوں کا مالک ہوا
اخلاق ایسا جس کی نرمی و نزاکت پر نسیم صبا شرما جائے
اور سختی ایسی کہ جمادات بھی جس کے آگے موم بن جائیں

علامہ اقبال چوتھے مصرعے میں فرماتے ہیں

زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اگر تم عشق و مستی کا زوال دیکھنا چاہتے ہو تو پھر حرفِ رازی کی طرف توجہ مبذول کرو، رازی مشہور فلسفی گزرے ہیں اور علامہ اقبال نے ان کے نظریات کو مسترد کر دیا ہے اسی لیے اس مصرع میں کہا ہے کہ اگر عشق و مستی کا زوال دیکھنا مقصود ہو تو حرفِ رازی کا مطالعہ کرو۔ رازی سے مراد امام فخر الدین رازی ہیں، ۵۴۴ھ میں مقام "رے" میں پیدا ہوئے منطق و فلسفہ کے امام تھے جلو میں تین سو شاگرد رہتے تھے۔ شرح اشارات اور تفسیر کبیر بے حد مشہور ہے۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلک شبیرم آرزوست

(پیام مشرق ۱۵۶)

علامہ نے اس شعر کے پہلے مصرعے میں چار لفظیں تیر، سنان، خنجر اور شمشیر استعمال کی ہیں' تیر جسے کمان کے ذریعے پھینکا جاتا ہے اور جس کا پیکان زخمی کرنے کا سبب بنتا ہے، سنان، نیزے کی انی، خنجر، چھرا، شمشیر، تلوار علامہ اقبال اس شعر کے ذریعے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں تیر وسنان اور خنجر وشمشیر میری آرزو اور تمنا ہے، یعنی ان ہتھیاروں سے اگر میرا واسطہ پڑے گا تو میں ان کے وار خندہ پیشانی سے برداشت کروں گا، میں ان ہتھیاروں سے گھبرانے والا اور پریشان ہونے والا نہیں ہوں، تم اگر ڈرپوک ہو تو میرے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ میں نے خطرے کو گلے لگا لیا ہے، تیر وتلوار سے کھیلنا میرا مشغلہ بن گیا ہے، تم کو معلوم نہیں کہ میں مسلک شبیری پر گامزن ہوں، میں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے راستے کو اپنا لیا ہے اور ان ہی کے راستے پر چل پڑا ہوں، اس لیے کہ یہ فداکاری جاں جانثاری اور قربانی کا راستہ ہے، اس مسلک میں موت سے ہم کنار ہوجانا ہی حیات ابدی کا پیش خیمہ ہے۔

علامہ اقبال نے امام حسین کے عمل کو درست قرار دیتے ہوئے اسے ایک مسلک سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے کہ میں بھی اسی مسلک کا راہی ہوں

از نگاہ خواجۂ بدر وحنین
فقر سلطان وارث جذب حسین

(جاوید نامہ ۳۶۶)

صاحب بدر وحنین کی نظر سے فقر و فاقہ سلطانی اور حکمرانی سب کچھ جذب حسین کی وارث ہے۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں دو جنگوں کا ذکر کیا ہے، غزوہ بدر جو ۲ھ میں بدر کے مقام

پر مدینہ منورہ سے تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر واقع ہوئی اور اس جنگ میں ۷۰ کافر واصل جہنم ہوئے جن میں امیہ، عتبہ، شیبہ، ولید اور حنظلہ ہیں۔ اور ۷۰ افراد گرفتار کیے گئے۔

اور غزوہ حنین اس کا نام غزوہ اوطاس اور غزوہ ھوازن ہے ماہ شوال ۸ ھ میں یہ غزوہ واقع ہوا مسلمانوں کی تعداد ۱۲ ہزار تھی اور حضرت علی نے پرچم اٹھا رکھا تھا۔

سورہ توبہ کی آیتیں ۲۵ سے ۲۸ تک اور آیت ۵۸ اس بارے میں نازل ہوئی اس جنگ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ صرف دس افراد ثابت قدم رہے جن میں نو کا تعلق بنی ہاشم سے تھا اور ان میں دسواں ایمن بن ام ایمن تھا حضرت ابوبکر نے فوج کی کثیر تعداد کو دیکھ کر کہا تھا کہ ہمیں ہزیمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیوں کہ ہم دشمن سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

(طبقات کبریٰ ص ۱۵۰)

سورہ توبہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ

(سورۃ التوبہ ۹:۲۵)

بے شک اللہ نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد کی بالخصوص حنین کے دن جب تمہاری کثرت نے تمہیں نازاں بنا دیا تھا پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی چناں چہ تم پیٹھ پھرا کر چلے گئے

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (سورۃ التوبہ ۹:۲۵)

پھر اللہ نے اپنے رسول پر ایمان والوں پر اپنی تسکین نازل فرمائی اور اس نے ملائکہ کے ایسے لشکر اتارے جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کو سزا دی اور کافروں کی یہی جزا ہے۔ پھر اس

کے بعد بھی اللہ جس کی چاہتا ہے توبہ قبول کر لیتا ہے اللہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اچانک حملے سے مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے اور وہ سراسیمہ تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنی سواری کی پشت سے آواز دی یَا اَنْصَارَ اللّٰہِ وَاَنْصَارَ رَسُوْلِہٖ اے اللہ اور رسول اللہ کے ناصرو! اَنَا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں اس وقت آپ کے فدا کاروں میں امیر المومنین علی بن ابی طالب، عباس بن عبدالمطلب، فضل بن عباس، اُسامہ بن زید اور ابوسفیان بن الحارث تھے جنھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حفاظت میں غفلت نہیں کی۔

حضرت عباس نے بلند آواز میں لوگوں کو پکارا لوگوں کی غیرت وحمیت جاگی وہ واپس آئے دوبارہ زبردست حملہ ہوا اور دشمن پسپا ہو گیا، اور شکست فتح میں تبدیل ہو گئی۔

بے خبر مرداں ز رزمِ کفر و دیں
جانِ من تنہا چو زین العابدین

(جاوید نامہ)

عام لوگ کفر و دین کی جنگ سے بے خبر ہیں، اور میں حضرت زین العابدینؑ کی طرح تنہا کھڑا ہوا ہوں۔

علامہ اقبال اس شعر میں یہ واضح کر رہے ہیں کہ کفر اور دین کی لڑائی جاری و ساری ہے اور عامۃ الناس اس حقیقت سے ناآشنا ہیں، لوگوں کو حقانیت اور صداقت کا علم نہیں ہے وہ حق و باطل کی معرکہ آرائی سے ناواقف ہیں، بدر، احد، خیبر و خندق، تبوک اور حنین سب کفر و دین کے معرکے تھے جن میں اسلام کو کامیابی ہوئی اور کفر و شرک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، ۶۱ ھ میں امام حسینؑ اور یزید کے درمیان جو معرکہ آرائی ہوئی وہ حق و باطل، سچ اور جھوٹ کی جنگ تھی یزید اپنا اسلام نافذ کرنا چاہتا تھا اور امام حسین علیہ السلام، آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے نمائندے کی حیثیت سے کربلا میں موجود تھے وہ علی المرتضیٰ اور حسن مجتبیٰ کے بھی

وارث تھے، علامہ اقبال کے نزدیک یہ معرکہ آج بھی ہو رہا ہے اس لیے کہ ان کے بقول

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

(بانگِ درا)

لیکن میں تنہا اس محاذ پر ڈٹا ہوا ہوں جس طرح شہادت حسین کے بعد مقابلے کے لیے ان کے فرزند ارجمند حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تنہا مقاومت کر رہے تھے اور تمام ظلم و ستم کا تنہا مقابلہ کر رہے تھے اسی طرح میں بھی محاذ پر تنہا کھڑا ہوا ہوں کوئی بھی میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

آج کا دور پر آشوب ہے ہر طرف افراتفری اور انتشار ہے گندم نما جو فروشوں نے ملک ومتاع پر قبضہ کر لیا ہے میں تنہا آزادی کی آواز بلند کر رہا ہوں اور اس میں میرا ہم نوا کوئی اور نہیں ہے میں میدان کارزار میں امام زین العابدین کی طرح تنہا اور اکیلا کھڑا ہوں نہ کوئی ناصر ہے نہ غمخوار نہ کوئی حامی ہے نہ دمساز، جس طرح امام زین العابدین نے قافلہ سالار کی حیثیت سے کربلا کے بعد کوفہ وشام کی منازل طے کر کے کامیابی کے ساتھ مدینہ منورہ واپس آئے میں بھی تنہا امام کی طرح اس محاذ جنگ پر ڈٹا ہوا اور جما ہوا ہوں۔

☆☆☆

سپاسِ جنابِ امیرؑ

سرودِ رفتہ

از

غلام رسول مہر

صادق علی دلاوری

(ص ۶۶ـ۶۸)

اے محوِ ثنائے تو زبانہا
اے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت
اے نوحِ سفینۂ محبت
اے ماحیِ نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے رمزِ خطِ وجوب و امکاں
تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سرّ نکاتِ محمدؐ
اے وصفِ تو جذبۂ محمدؐ
گردوں کہ بہ رفعت ایستادہ است
از بامِ بلندِ تو فتادہ است

ہر ذرّۂ درگہت چو منصور
در جوش ترانۂ انا النّور
بے تو نتواں بہ او رسیدن
بے او نتواں بہ تو رسیدن
فردوس ز تو چمن در آغوش
از شانِ تو غیرت آئنہ پوش
جانم بہ غلامیِ تو خوشتر
سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر
ہشیارم دستِ بادۂ تو
چوں سایہ زپا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہ ہوشم
گوئی کہ نصیریِ خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است
در پردۂ خامشی نیاز است
لیکن چکنم مے تولا
تندست بروں فکند زمینا
ز اندیشۂ عاقبت رہیدم
جنسِ غمِ آلِ تو خریدم
فکرم چو بجستجو قدم زد
در ذرّہ شد و دو عالم زد
در وحشتِ طلب بسے دویدم
دامن چوں گرد باد چیدم

در آبلہ خارہا خلیدہ
صد لالہ بہ قدم دمیدہ
افتادہ گرد بہ روے کارم
شرمندۂ دامن غبارم
پویاں پے خضر سوے منزل
بر دوش خیال بستہ محمل
جویاے مے و شکستہ جامے
چوں صبح بہ باد چیدہ دامے
پیچیدہ بہ خود چو موج دریا
آوارہ چو گرد باد صحرا
وا ماندہ ز دردِ نارسیدن
در آبلۂ شکستہ دامن
عشق تو دلم ربود ناگاہ
از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ ز عشق و علم ساخت
بت خانۂ عقل را حرم ساخت
چوں برق بہ خرمنم گزر کرد
از لذت سوختن خبر کرد
برباد متاع ہستیم داد
جامے ز مے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم
چوں نقش ز خود جدا فتادم

پیراہن ما و من دریدم
چوں اشک ز چشم خود چکیدم
خاکم بہ فراز عرش بردی
زاں راز کہ با دلم سپردی
واصل بہ کنار کشتیم شد
طوفان جمال زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم
پروائے ملامتے ندارم
از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم ، گریم، تپم، گدازم

یہ نظم جنوری ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی تمہیدی نوٹ سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اہل ذوق مدیر ''مخزن'' کو لکھا کرتے تھے کہ اقبال کا فارسی کلام بھی شائع کیجئے احباب کے اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقبال نے مندرجۂ ذیل نظم اشاعت کے لیے عنایت فرمائی اُس زمانے میں اقبال یہ نظم بہ غرض اظہار عقیدت صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے۔

(مخزن بابت جنوری ۱۹۰۵ صفحہ ۳۷_۳۸) اس نظم میں کل ۳۲ اشعار ہیں اس نظم کے آخری تیرہ شعر علامہ اقبال کے شعری مجموعے پیام مشرق میں موجود ہیں نظم کا عنوان ہے ''عشق'' اور اسی کے ذیل میں یہ اشعار ہیں ص ۲۳۲ کلیات اقبال فارسی)

ا۔ اے محو ثنائے تو زبانہا
اے یوسف کاروان جانہا

اے میرے مولا علی آپ کی تعریف وتوصیف میں پوری کائنات رطب اللسان ہے ہر زبان پر آپ ہی کی ثنا ہے خواہ وہ انسان ہوں، جنات ہوں یا ملک، تمام وحوش وطیور بھی آپ

ہی کی مالا جپ رہے ہیں اور آپ ہی کی مدح سرائی میں مصروف ہیں ہماری حیات کا جو کارواں رواں دواں ہے آپ ہی اس کے میر کارواں ہیں ہماری زندگیوں پر آپ کا بہت بڑا احسان ہے، ہماری مادی زندگی ہو یا معنوی آپ ہر زندگی کے سربراہ ہیں، آپ ہی کی وجہ سے ہماری زندگی نور سے معمور ہے کیوں کہ آپ اس قافلے کے یوسف ہیں جس کا جمال ہماری حیات کے ہر گوشے کو منور اور فروزاں کر رہا ہے

ع اے باب مدینۂ محبت

اے نوح سفینۂ محبت

میرے آقا آپ تو محبت کے شہر کے دروازہ ہیں کوئی بھی اس شہر میں آپ کی اجازت اور رخصت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا ہر آنے اور جانے والے کو آپ کا وسیلہ درکار ہے، آپ سے ملاقات لازمی ہے، آپ کی محبت ضروری ہے، اقبال نے مدینے سے سرکار دو عالم فخر آدم و بنی آدم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو مراد لیا ہے اور اس مصرع میں اس مشہور و معروف حدیث کی طرف اشارہ ہے جسے اکثر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں کی زینت بنایا ہے، مستدرک علی الصحیحین میں ابن عباس سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:

أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا فَمَنْ أَرَادَ الْمَدِينَةَ فَلْيَأْتِ الْبَابَ قَالَ الْحَاكِمُ هٰذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الْإِسْنَادِ

میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے بس جو بھی شہر میں آنا چاہے تو اسے چاہیے کہ دروازے پر آئے حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔

علامہ اقبال نے مثنوی اسرار خودی و رموز بیخودی میں سپاس جناب امیر کے نام سے جو نظم تحریر کی اس کے ص ۵۵ پر اس کی تائید میں اس طرح فرماتے ہیں۔

ذات او دروازۂ شہر علوم

(علی کی ذات تو شہر علم کا دروازہ ہے)

زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم
(اور حجاز چین اور روم سب انہی کی زیر نگیں ہیں)

☆☆

اے نوح سفینۂ محبت

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اے سفینۂ محبت کے نوح اس مصرع میں یہ تلمیح ہے کہ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے ان تمام انسانوں، حیوانوں اور چرند و پرند کو بچایا جو اس کشتی میں سوار تھے اسی طرح حضرت علی سفینۂ محبت کے نوح ہیں حضرت علی اہل بیت کے ایک فرد ہیں اور حضور سرور کائنات نے اہل بیت کے بارے میں فرمایا ہے۔

مَثَلُ اَھلِ بَیتِی کَمَثَلِ سَفِینَۃِ نُوحٍ مَن رَکِبَ فِیھَا نَجَا وَمَن تَخَلَّفَ عَنھَا ضَلَّ وَ غَرَقَ وَھَوٰی (تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی جلد ۷ ص ۳۹۱ مطبوعہ مکتبۃ الاعلام الاسلامیہ ۱۴۱۳ ہجری)

میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس کشتی میں سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جس نے اسے چھوڑ دیا وہ گمراہ ہو گیا، ڈوب گیا اور خواہشات کا پیروکار بن گیا، قرآن کریم سے پتا چلتا ہے کہ حضرت نوح کے بیٹے اور بیوی دونوں کشتی میں سوار نہیں ہوئے اور ڈوب گئے، علامہ اقبال فرمانا چاہتے ہیں کہ حضرت علی سفینۂ محبت کے نوح ہیں اگر ہم ان کے دامن سے وابستہ رہیں گے اور ان کی محبت کی کشتی میں سوار ہو جائیں گے تو کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔

۳۔ اے ماحیِ نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبرِ دلِ من

میرے مولا آپ کی ذات ستودہ صفات نے میرے تمام باطل اور غلط نقوش کو مٹا دیا ہے جتنے غلط خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے ان سب کو یکسر ختم کر دیا یعنی جب سے آپ کی محبت نے میرے دل میں بسیرا کیا ہے میرے تمام اوہام باطلہ اور افکار پریشاں

رخصت ہو گئے اس لیے کہ جس دل میں علی کی محبت آ جاتی ہے تمام اصنام گر پڑتے ہیں جس طرح اللہ کے گھر خانہ کعبہ کو حضرت علی نے بتوں سے پاک کیا تھا اسی طرح مومن کا دل جو جلال و جمال الٰہی کا مظہر ہے اسے بھی علی کی محبت ہی پاک صاف اور طاہر و مطہر بنا سکتی ہے۔

دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ اے میرے دل کے خیبر کو فتح کرنے والے اس شعر میں یہ تلمیح ہے کہ حضرت علی نے ۳۹ دنوں تک فتح نہ ہونے والے قلعے کو جس کا نام قموص تھا مرحب کو قتل کر کے اس پر فتح و کامرانی کا جھنڈا لہرا دیا تھا، علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اسی طرح اے مولائے کائنات آپ نے میرے دل کو فتح کر لیا ہے اس میں آپ کی محبت کا پرچم لہرا رہا ہے، غزوہ خیبر ۷ھ کو واقع ہوئی اور قلعہ خیبر کو حضرت علی نے فتح کیا تھا محمد بن اسماعیل بخاری اپنی مشہور کتاب الصحیح البخاری جزو خامس ص ۲۲۷ مطبوعہ مصر حدیث ۳۷۰۱ اور ۳۷۰۲ میں فرماتے ہیں

اخبرنی سھل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم قال یوم خیبر لاعطین الرایۃ غدًا رجلا یفتح اللہ علی یدیہ یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہٗ

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے غزوہ خیبر کے موقع پر فرمایا میں ضرور بالضرور پرچم کل اسے عطا کروں گا جو مرد ہوگا اللہ اس کے دونوں ہاتھوں پر کامیابی عطا کرے گا وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول اس سے محبت کرتے ہوں گے، جب صبح ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا آئینؑ علی بن ابی طالب علی کہاں ہیں؟ انھیں بلایا اور ان کو پرچم عطا فرمایا۔ علامہ اقبال اسی بات کو فرماتے۔

عشق بانانِ جویں خیبر کشاد

عشق نے جو کی روٹی کھا کر باب خیبر کو کھول دیا اور جسے چالیس آدمی بند کرتے اور کھولتے تھے، اسے تنہا اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے سپر بنا دیا، علامہ اقبال اسی مضمون کو اپنی نظم در شرح اسرار اسمائے علی المرتضیٰ رموز بے خودی ص ۵۳ پر فرماتے ہیں۔

زیر پاش اینجا شکوہ خیبر است

خیبر کی شان و شوکت اور اس کا شکوہ و جلال اس دنیا میں حضرت علی کے پیروں تلے پامال ہو رہا ہے۔

اے سرِّ خطِ وجوب و امکاں
تفسیرِ تو سورہ ھائے قرآں

اے میرے مولا آپ کی ہستی وجوب و امکان کا وہ خط ہے جو دونوں میں امتیاز قائم کرتا ہے دونوں کو الگ الگ واضح کرتا ہے اور آپ کی ذات والا صفات کا تعارف قرآن کریم کی سورتیں ہیں اس شعر میں علم کلام کے نہایت اہم موضوع کو بیان فرمایا ہے اللہ نام ہے اس ذات کا جو واجب الوجود ہے اور اس میں تمام صفات کمال یکجا ہیں اس کے علاوہ پوری کائنات ممکن الوجود ہے یعنی اپنے وجود میں کسی خالق اور پیدا کرنے والے کی محتاج ہے، محمد و آل محمد نور اول اور تخلیق اول کے اعتبار سے عالم ممکنات میں سب سے اعلیٰ اور بالا ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرماتے ہیں کہ أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُورِي (اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق فرمایا ہے) اور فرمایا: "أَنَا وَعَلِيٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدٍ" میں اور علی ایک ہی نور کے دو حصے ہیں یہ وہ ہستیاں ہیں جو اُمتِ وَسَط ہیں خالق اور مخلوقات کے درمیان رابطہ ہیں، واسطہ ہیں اسی لیے علامہ اقبال نے حضرت علی کو خط وجوب و امکان کا راز قرار دیا ہے۔

تفسیرِ تو سورہ ھائے قرآں

یعنی اگر ذات علی کو پہچاننا چاہتے ہو تو قرآن کریم کی سورتوں کو پڑھو قرآن ان کا قصیدہ خواں بن کر آیا ہے

أَخْرَجَ ابْنُ عَسَاكِرَ قَالَ مَا نَزَلَ فِي أَحَدٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَىٰ مَا نَزَلَ فِي عَلِيٍّ وَأَخْرَجَ أَيْضًا نَزَلَ فِي عَلِيٍّ ثَلَاثُمِائَةِ آيَةٍ

ابن عساکر نے تخریج کی ہے کہ کسی کی شان میں قرآن میں اتنی آیتیں نازل نہیں ہوئیں جتنی حضرت علی کی شان میں نازل ہوئیں اور یہ بھی تخریج کی ہے کہ حضرت علی کی شان میں

قرآن کریم میں تین سو آیتیں نازل ہوئیں۔

علامہ اقبال فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کی شان سے واقف ہونا چاہیں تو قرآن کی سورتوں کی طرف رجوع کریں کیوں کہ قرآن کریم کی سورتیں ہی آپ کی ذات کی تفسیر تشریح توضیح اور تعارف کرا سکتی ہیں۔

ے اے مذہب عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اے علی آپ مذہب عشق کی نماز ہیں۔ اور آپ کا سینہ رازہائے سربستہ کا امین ہے، علامہ اقبال نے عشق کو ایک مذہب قرار دیا ہے اور جس طرح ہر مذہب، دین اور آئین میں عبادت کا کوئی نہ کوئی طریقہ رائج ہوتا ہے اور ہر مذہب کا پیروکار اسی طرح اپنے رب، خالق اور مالک کی بندگی اور عبادت کرتا ہے۔ ہندو بھجن گا کر عبادت کرتے ہیں عیسائی گرجا گھر میں ہر اتوار کو بائبل پڑھ کر اپنے طریقے سے عبادت کرتے ہیں اور یہودی بروز ہفتہ اپنے سینیگاگ میں اپنے طریقے سے عبادت کرتے ہیں اور مسلمان نماز پنج گانہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اسی طرح عشق کا ایک مذہب ہے اور اس مذہب کی نماز محبت علی ہے ان سے تعلق ہے ان سے لگاؤ ہے جیسا کہ مرزا غالب فرماتے ہیں۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

حضرت علی علیہ السلام ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے آغاز رسالت سے حضرت علی کو اپنا راز دار بنایا اور علی نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے وارث تھے، آنحضرت نے ان کے بارے میں فرمایا تھا

"خَازِنُ سِرِّی بَعْدِی عَلِیّ"

میرے بعد علی میرے راز کے امین ہیں

عَلِیٌّ بَابُ عِلْمِی وَ مُبَیِّنٌ لِاُمَّتِی مَا اُرْسِلْتُ بِهٖ مِنْ بَعْدِی (حاکم دیلمی اور ابن

غدی نے ابوذر سے)

علی میرے علم کے دروازہ ہیں اور میں جس چیز کو دے کر بھیجا گیا ہوں وہ میرے بعد میری اُمّت کو ان چیزوں کی وضاحت کریں گے، حضرت علی کا سینہ رازہائے نبوت کا امین تھا اور آپ نے اپنے خطبات، خطوط اور اقوال وحکم کے ذریعے نہ جانے کتنے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے اور دنیا کو علم پہنچایا ہے اور پوری کائنات کو دولتِ علم سے مالا مال کیا ہے۔

۶۔ اے سرِّ نبوّتِ محمدؐ

اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ

اے وہ ذات جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی نبوت کا راز ہے اور آپ کی تعریف و توصیف درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی توصیف وتعریف ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ کو سید الانبیاء والمرسلین قرار دیا اور خاتم النبیین کی حیثیت سے سب سے آخر میں مبعوث کیا اور ہر نبی پر آپ کی نبوت کو ماننا لازم قرار دیا اور عالم ارواح میں سب سے اس کا اقرار لیا۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ۝ (سورۂ آل عمران ۳:۸۱)

اور یاد کیجیے جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب وحکمت عطا کروں پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی اللہ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد لے لیا انھوں نے کہا ہم نے اقرار کیا اللہ نے فرمایا تم گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کو قیامت تک کے لیے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا آپ اسی محمد کی نبوت ورسالت کے راز ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے فرمایا:

يَا عَلِيُّ لَحْمُكَ لَحْمِي وَ دَمُكَ دَمِي

اے علی آپ کا گوشت میرا گوشت ہے اور آپ کا خون میرا خون ہے۔

یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ

اے علی تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں اس بنیاد پر وصف علی بیان کرنا درحقیقت وصف پیغمبر کا تذکرہ ہے اس لیے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا ہے۔

لَا یَعْرِفُ اللّٰہَ حَقَّ مَعْرِفَتِہٖ اِلَّا اَنَا وَعَلِیٌّ وَلَا یَعْرِفُنِیْ حَقَّ مَعْرِفَتِیْ اِلَّا اللّٰہُ وَعَلِیٌّ لَا یَعْرِفُ عَلِیًّا حَقَّ مَعْرِفَتِہٖ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَا

اللہ کی حقیقی معرفت سوائے میرے اور علی کے کسی کو حاصل نہیں اور میری حقیقی معرفت کوئی نہیں رکھتا سوائے اللہ اور علی کے اور علی کو صحیح معنی میں کوئی نہیں پہچانتا سوائے اللہ کے اور میرے۔ (بحارالانوار ۴۰/۲۰۰ باب ۹۳)

اسی لیے غالب آنحضرت کی مدحت سرائی کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

اے غالب میں نے حضور پرنور کی تعریف اللہ پر چھوڑ دی ہے کیوں کہ اللہ کی پاک ذات ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے مرتبہ سے آشنا اور واقف ہے۔

ے گردوں کہ بہ رفعت ایستاد است
از بام بلند تو فتاد است

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ یہ آسمان جو بلندی اور رفعت میں ہر ایک سے بالا اور اعلیٰ ہے اور اس سے اونچی کوئی اور شے نہیں ہے لیکن وہ بھی اے علی آپ کی ذات والا صفات کی بلندی رفعت اور عظمت کے سامنے پست ہے۔ سچ ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ علی کا نام علی ہے علی کا کام علی ہے علی کا مقام علی ہے علی ہر منزل پر اور ہر مقام پر علی ہے اور یہ بات بالکل جلی اور منجلی ہے غالباً علامہ اقبال کا اشارہ اس طرف ہے کہ جب پیغمبر اکرم معراج پر تشریف لے گئے تو آپ نے آسمانوں کو اپنے قدموں تلے روندا اور قاب قوسین کی منزل پر فائز ہوئے اسی اور

اتنی بلندی ان کے علاوہ کسی اور انسان کو نصیب نہیں ہوئی لیکن جب خانہ کعبہ میں بتوں کا قبضہ ہو گیا تو فتح مکہ کے بعد آنحضرتؐ نے بتوں کی صفائی کے لیے حضرت علی کو اپنے دوش پر بلند کیا۔ شیخ محدث دہلوی اپنی کتاب مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۳۳۴ پر اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ان میں سب سے اونچا اور بڑا بت وہ تھا جسے ھُبل کہتے تھے علی المرتضیٰ نے عرض کی یا رسول اللہ اپنے قدم ناز میرے کندھے پر رکھیے اور ان بتوں کو گرا دیجئے حضور نے فرمایا اے علی تم میں بار نبوت کے اٹھانے کی طاقت نہیں ہے تم میرے کندھوں پر آ ؤ اور ان بتوں کو گراؤ امتثالاً لِلْاَمر رسول اللہ کے دوش مبارک پر آئے اور ان کو گرا دیا اس حالت میں حضور نے علی المرتضیٰ سے پوچھا خود کو کیا دیکھتے ہو عرض کیا یا رسول اللہ میں ایسا دیکھتا ہوں کہ گویا تمام حجابات اٹھ گئے ہیں اور میرا ساق عرش سے جا ملا ہے اور جدھر میں ہاتھ پھیلاؤں وہ چیز میرے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ حضور نے فرمایا اے علی تمہارا کتنا اچھا وقت ہے کہ تم کارِ حق ادا کر رہے ہو اور میرا حال کتنا مبارک ہے کہ میں بارِ حق اٹھائے ہوئے ہوں۔

(مدارج النبوۃ)

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی بلندی اور رفعت کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے:

قِیل لی قل فی العلی مدحاً
ذکرہ یخمد ناراً موصدہ
قلت لا اُقْدِم فی مَدْحِ امْرِءٍ
ضل ذواللب الی ان عبدہ
والنبی المصطفیٰ قال لنا
لیلۃ المعراج لما صعدہ

وضع الله بظهری یده
فاحس القلب ان قد برده
وعلی واضع اقدامه
فی محل وضع الله یده

☆☆☆

مجھ سے کہا گیا کہ تم علی کی مدح کے بارے میں کچھ کہو
علی کا ذکر تو جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھا دیتا ہے
میں نے کہا میں ایسی ہستی کی مدح کرنے میں سبقت کیسے کروں
بڑے بڑے عقلا گمراہ ہو کر ان کی پرستش کرنے لگے
اور حضرت محمد مصطفیٰ نے ہم سے فرمایا (یعنی حدیث سے پتا چلا)
کہ شب معراج جب وہ بلندی پر پہنچے
تو اللہ نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا
تو دل نے اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک کو محسوس کیا
اور علی نے (بتوں کو توڑتے وقت) اپنے قدموں کو
اس جگہ رکھا ہے جہاں اللہ نے ہاتھ رکھا تھا

(ینابیع المودۃ شیخ سلیمان قندوزی ص ۱۳)

(نوٹ: یہ امام شافعی کا عقیدہ ہے اور ہم اللہ کے جسم و
جسمانیات کے قائل نہیں ہیں)

۸۔ ہر ذرۂ درگہت چو منصور
در جوش ترانۂ انا الطور

آپ کی بارگاہ کا ہر ذرہ منصور کی طرح یعنی حسین بن منصور حلاج کی طرح جوش میں آ کر فخریہ انداز میں یہ ترانہ پڑھ رہا ہے کہ "انا الطور" میں طور ہوں۔

اس شعر میں منصور سے تشبیہ دے کر تلمیح بیان کی ہے حسین بن منصور حلاج نے "ہمہ اوست" کے فلسفہ پر عمل پیرا ہو کر انا الحق کا نعرہ لگایا تھا اور یہ کہا تھا کہ میں حق ہوں، یہ فلسفی عابد اور زاہد تھا۔ یہ فارس کا باشندہ تھا اور بعد میں عراق کے ایک شہر واسط میں بسیرا اختیار کیا اس کے عقائد کی بنیاد پر مقتدر عباسی نے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اس کی لاش کو جلا ڈالا اور راکھ دریائے دجلہ میں ڈال دی اور سر کو بغداد کے پل پر لٹکا دیا اُسے ۳۰۹ھ میں قتل کیا گیا۔ "ہمہ اوست" یعنی ہر شے خدا ہے اور "ہمہ از وست" ہر شے خدا سے ہے یہ فلسفہ صوفیوں کے ہاں رائج ہے۔ اسی بنیاد پر مرزا غالب نے کہا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

یعنی ہر قطرہ کے دل سے یہ آواز آرہی ہے کہ میں سمندر ہوں کیوں کہ سمندر کل ہے اور قطرہ جزو ہے، اور ہر جز کل کا حصہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اس شعر میں یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اے علی جس زمین پر آپ چلتے ہیں آپ کے نشانات قدم ثبت ہیں وہ زمین عظمت، رفعت اور منزلت میں کوہ طور سے کم نہیں ہے کوہ طور پر خدا کی تجلی ہوئی تھی اس لیے اس جگہ کو تمام زمینوں پر امتیاز حاصل ہے اسی طرح جس جگہ آپ رہتے ہیں اور جس زمین پر آپ قدم رکھتے ہیں اس زمین کا وہ ذرہ فخر سے پھولا نہیں سماتا اور اس سے یہ آواز آرہی ہے کہ "انا الطور" میں منزلت میں کوہ طور کی مانند ہوں۔

۹۔ بے تو نتواں باو رسیدن
بے او نتواں بتو رسیدن

اے علی آپ کے بغیر خدا تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں
اور خدا کے بغیر آپ کی ذات کا عرفان ناممکن ہے

علامہ اقبال خداوند عالم کی بارگاہ تک رسائی کے لیے حضرت علی کو وسیلہ ذریعہ اور واسطہ بنا رہے ہیں کیوں کہ وہی کسی کا تعارف کرا سکتا ہے جو اُسے اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہو چوں

کہ علی دریائے معرفت کے شناور ہیں، آپ نے اللہ کی کما حقہ معرفت حاصل کر لی ہے اس لیے علامہ اقبال انہی کے ذریعے سے خدا سے وصال چاہتے ہیں۔

حضرت علی نے نہج البلاغہ خطبہ نمبرا میں فرمایا ہے۔

اول الدین معرفتہ دین کی پہلی منزل اللہ کی معرفت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:

لا یعرف اللہ حق معرفتہ الا انا وعلی

اللہ کی حقیقی معرفت سوائے میرے اور علی کے کسی کو حاصل نہیں اس شعر کے دوسرے مصرع میں علامہ نے فرمایا ہے کہ اے میرے مولا آپ کا عرفان اور آپ کی شناخت بھی آسان نہیں ہے اور آپ کی ذات تک رسائی اور آپ کی ہستی تک پہنچنے کے لیے مجھے اللہ کی مدد درکار ہے قرآن کریم نے آپ کے فضائل اور محامد جس انداز سے بیان فرمائے ہیں وہ در حقیقت اللہ کی جانب سے آپ کا تعارف ہے۔

۱۰۔ فردوس ز تو چمن در آغوش

از شان تو حیرت آئنہ پوش

اے علی آپ کی ہستی کی وجہ سے اور آپ کے وجود کے سبب جنت الفردوس آرائش و زیبائش اور حسن و جمال کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور آپ کی شان اور منزلت اتنی عظیم اور منفرد ہے کہ حیرت واستعجاب بھی آئنہ پوش بن گئی ہے۔ یعنی اس میں ہمت نہیں ہے کہ وہ آپ کی عظمت اور شان وشوکت کا سامنا کر سکے۔

۱۱۔ جانم بہ غلامی تو خوشتر

سر بر زدہ ام ز جیب قنبر

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اے میرے مولا اور آقا میری زندگی اگر آپ کی غلامی میں بسر ہو تو اس سے بہتر اور عمدہ بات کیا ہو سکتی ہے اس لیے کہ جو آپ کے غلام ہیں وہ دنیائے تصوف میں آقا کی منزلت رکھتے ہیں حضرت قنبر جو آپ کے غلام خاص تھے وہ خواجہ قنبر کے

نام سے سلسلۂ رشد و ہدایت سے منسلک ہیں۔

میں نے بھی قنبر کے گریبان سے جھانک کر آپ کو دیکھا ہے اور سر باہر نکالا ہے۔

انوار العلویہ میں ہے قنبر بادشاہوں کی نسل سے تھے اور امیر المومنین کی غلامی کو باعث فخر سمجھتے ہیں امام عالی مقام جب بھی گھر سے باہر تشریف لے جاتے قنبر ان کے پیچھے پیچھے تلوار لے کر محافظ کی حیثیت سے چلتے تھے۔

رجال کبیر میں روایت ہے کہ ان سے سوال کیا گیا تم کس کے غلام ہو انھوں نے کہا کہ "میرا مولیٰ وہ ہے کہ جس نے دو تلواروں سے جنگ کی، دو نیزوں سے بھالا مارا دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی دو دفعہ بیعت کی اور دو ہجرتیں کیں اور ایک لمحے کے لیے بھی کفر و شرک کی آغوش میں نہ رہا"۔ اَنَا مَوْلٰی صَالِحِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَوَارِثِ النَّبِیِّیْنَ وَ خَیْرِ الْوَصِیِّیْنَ وَ اَکْبَرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَیَعْسُوْبِ الدِّیْنِ وَنُوْرِ الْمُجَاهِدِیْنَ وَرَئِیْسِ الْبَکَّائِیْنَ وَزَیْنِ الْعَابِدِیْنَ۔ میں غلام ہوں مومنین میں صالح انبیاء کے وارث بہترین وصی، دین کے یعسوب، مجاہدین کے نور، خوف خدا میں رونے والوں کے سردار اور زین العابدین کا۔

محبت علی کے جرم میں انھیں حجاج بن یوسف نے قتل کر دیا۔

اقبال ایسے ہی اعلیٰ کردار فرد کے ذریعے علی تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ هشیارم و مست بادۂ تو
چوں سایہ زپا فتادۂ تو

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں بے ہوش یا مدہوش نہیں ہوں میں ہشیار ہوں، بیدار ہوں، جاگ رہا ہوں، متوجہ ہوں لیکن میں آپ کی محبت کی شراب اور ولا کے ساغر و جام سے مست اور سرشار ہوں۔

مرزا غالب نے اسی بات کو اس انداز میں کہا ہے۔

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

دوسرے مصرع میں فرمایا:

اور اے علی سائے کی مانند میں آپ کے قدموں میں جھکا ہوا ہوں۔

قرآن کریم نے سورۂ نحل میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ (سورۂ النحل ۱۶: ۴۸)

کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سایے دائیں اور بائیں جانب سے ڈھلتے ہیں اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے۔

جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے تعظیمی سجدہ کیا تھا اور برادران یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدے میں گر گئے تھے دراصل یہ سجدہ اللہ کو تھا اور یہ لوگ قبلہ تھے علامہ اقبال فرماتے ہیں میں بھی سایے کی طرح ان کے قدموں میں جھک رہا اور ان کے وسیلے اور واسطے سے خداوند عالم کے حضور سجدہ ریز ہوں۔

۱۳۔ از ہوش شدم مگر بہ ہوشم

گوئی کہ نصیری خموشم

علامہ اقبال فرماتے ہیں میرا ہوش وحواس جاتا رہا ہے میں مدہوش الفت حیدر ہوں مگر اس کے باوجود میرے ہوش وحواس درست ہیں میں مکمل فہم وادراک، عقل وشعور اور فراست سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ حضرت علی کی محبت، الفت اور چاہت نے میرے ہوش وحواس پر قبضہ جما لیا ہے لیکن اگر آپ مجھے نصیری کہیں گے تو میں مہر بلب رہوں گا اور خاموشی کو اپنا شعار بنائے رکھوں گا۔ اس بارے میں اپنی زبان سے کچھ نہ کہوں گا (موافقت میں اور نہ ہی مخالفت میں)۔

۱۴۔ دانم کہ ادب بہ ضبط راز است

در پردۂ خامشی نیاز است

مجھے یہ بات معلوم ہے کہ ادب واحترام اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ رازہائے مخفی اور اسرار

مخفی کو پوشیدہ ہی رکھا جائے، صبر وضبط سے کام لیا جائے اور اسے کسی لمحہ اور کسی آن ظاہر نہ کیا جائے یعنی علامہ اقبال اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ مجھے جو مولائے کائنات حضرت علی سے الفت ومحبت ہے تو یہ ایک مخفی راز ہے اسے عام کرنا اور طشت از بام کرنا لازم نہیں ہے بلکہ اخلاق وادب اور تہذیب وشائستگی اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے پوشیدہ رکھا جائے اور یہی محبت و وجاہت کا حسن ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ خاموشی کا پردہ ڈالنا ہی نیاز مندی کی علامت ہے۔ جس طرح یہ مشہور ہے کہ "افضل الزهد اخفاء الزهد" بہترین زہد یہ ہے کہ زہد کو پوشیدہ رکھا جائے اس طرح بہترین محبت وہی ہے جسے مخفی اور پوشیدہ رکھا جائے اور کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

۱۵۔ لنکا چہ کنم مے تولا
تند است بروں فتد زمینا

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں کیا کروں تولا اور محبت کی شراب ایسی تیز ہے جو مینا (شراب کی صراحی) سے چھلک رہی ہے۔ تولا کے معنی ہیں محبت اور دوستی اور اس کی ضد تبرا ہے جس کے معنی ہیں بیزاری اس شعر میں بطور استعارہ یہ الفاظ استعمال کیے ہیں "مے تولا" تند، مینا وغیرہ۔

یہاں شراب سے مراد حضرت علی کی ولایت کی شراب ہے جس کا اعلان ۱۸ ذی الحجہ کو غدیر خم کے میدان میں ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

مَن کنتُ مَولاہُ فعلی مولاہ

میں جس کا مولیٰ ہوں علی اس کا مولیٰ ہے

زاہد رحیم عاقبت رحیدم
جنس غم آل تو خریدم

علامہ اقبال کا یہ شعر نہایت خوب صورت شعر ہے جو عقیدت سے بھرپور اور خلوص سے مملو ہے وہ فرماتے ہیں۔

اس دنیا کا ہر فرد اپنے انجام سے پریشان رہتا ہے، آخرت کی فکر کرتا ہے، نامہ عمل میں ایسی باتیں مندرج کرانا چاہتا ہے جس سے عاقبت سنور جائے اس لیے کہ "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَة" دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے یہاں پر جو بھی بیج بوؤ گے تم اسی کی فصل آخرت میں کاٹو گے، علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا سرمایہ مول لے لیا ہے جس کے بعد مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں رہی اور وہ ہے آل محمد کے غم کی جنس یعنی غم ایک جنس کا نام ہے خریدار اقبال ہیں اور وہ اس غم کا سودا کر رہے ہیں یعنی اسے اپنا غم بنا رہے ہیں یعنی آل محمد کے غم والم کو میں نے دل میں بسا لیا ہے اور ان کے غم میں آنکھوں سے اشک رواں ہیں ان کا غم ہی میرے لیے سامان اور سرمایہ نجات ہے، جیسا کہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہے۔

مَنْ بَكَى وَأَبْكَى وَتَبَاكَى وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّة

جو بھی امام حسینؑ کے غم میں رویا رلایا یا رونے والے کی صورت بنائی تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔

۱۷۔ فکرم چو بجستجو قدم زد

در دیر شد و درِ حرم زد

علامہ کہتے ہیں کہ جب میں نے تلاش حق میں جستجو کے میدان میں قدم رکھا تو میں دیر یعنی نصاریٰ کی عبادت گاہ میں گیا اور وہاں سے حرم کے دروازے پر میرے قدم آگئے۔

علامہ اقبال درحقیقت یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ تلاش حق کا سفر کس طرح جاری رکھنا چاہیے اور کن مراحل سے گزر کر صداقت تک رسائی حاصل ہوسکتی ہے، ہر مذہب کا مطالعہ کرنا ان کے رسم ورواج پر غور کرنا اور ان کے اصول وفروع کو پرکھنے کے بعد اگر کوئی دائرہ اسلام میں قدم رکھے گا تو اس کا اسلام محکم اور مستحکم ہوگا جس طرح حضرت سلمان فارسی نے مذہب کے مطالعے کا سفر طے کیا تھا اور نصرانیت اور دیگر مذاہب اور ان کی کتب کا مطالعہ کیا تھا اور آخرکار مدینہ منورہ میں آنحضرت سے ملاقات کی حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور دیگر مومنین پر سبقت لے گئے۔

۱۸۔ در دشتِ طلب بسے دویدم
دامن چو گرد باد چیدم

میں طلب اور جستجو کے صحرا میں کافی دوڑتا رہا، یعنی اس ضمن میں کافی زحمتیں اٹھائیں صحراؤں کی خاک چھانی اور بگولے کی طرح اپنا دامن سمیٹتا رہا یعنی حق کی تلاش میں کافی سرگرداں رہا اور دشت وصحرا کے چکر لگاتا رہا۔

۱۹۔ در آبلہ خارھا خلیدہ
صد لالہ ز قدم دمیدہ

صحرائے جستجو میں کانٹوں پر بھی چلنا پڑا اور چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور کانٹے ان آبلوں میں چبھنے لگے زحمت اور تکلیف کی جانب اشارہ ہے یہ کمال شاعری ہے کہ صحراؤں میں چلنے سے جو آبلے پڑ گئے ہیں ان کے زخمی ہونے کو پھول کے کھلنے سے تشبیہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب آبلوں میں کانٹے چبھے تو قدموں سے خون بہا اور قدموں تلے گل لالہ کھل اٹھا، لالہ کا پھول سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔

۲۰۔ افتادہ گرہ بہ روئے کارم
شرمندۂ دامنِ غبارم

ابھی صحراؤں میں سے گزرنے کی داستان بیان کر رہے ہیں کہ میرے کام میں گرہ پڑ گئی ہے یعنی رکاوٹ آگئی ہے میں اپنے دامن کے غبار سے شرمندہ ہوں، جب غبار چھا جاتا ہے تو راستا دکھائی نہیں دیتا مراعاۃ النظیر کے طور پر دامن غبار اور گرہ لائے ہیں۔

۲۱۔ پویاں پئے خضر سوئے منزل
بر دوشِ خیال بستہ محمل

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں خضر علیہ السلام کے پیچھے منزل کی جانب رواں دواں ہوں میں نے اپنے خیال اور فکر کے دوش (کندھے) پر اپنے محمل کو باندھ لیا ہے۔

خضر اس عظیم ہستی کا نام ہے جو لوگوں کو راستا بتاتے اور منزل تک پہنچاتے ہیں حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انکا واقعہ سورہ کہف میں موجود ہے یہ علم باطنی میں درجہ کمال پر فائز تھے، علامہ اقبال فرمانا چاہ رہے ہیں کہ میں نے صحرا صحرا تلاش جاری رکھی تو آخر کار مجھے خضر راہ مل گیا اور میں اپنی منزل کی سمت روانہ ہو گیا، صحرا کے ساتھ محمل کا بھی تصور ہے تو انھوں نے خیال کے کندھوں پر محمل کو اٹھا رکھا ہے۔

۲۲۔ جویائے مئے و شکستہ جامے
چوں صبح بہ باد چیدہ دامے

میں شراب کا متلاشی ہوں لیکن میرا جام شکستہ اور ٹوٹا ہوا ہے صبح کی طرح ہوا کے سامنے اپنا دامن سوال پھیلا دیا ہے۔ اپنی بے کسی اور بے بسی کو بیان کر رہے ہیں کہ میں شراب محبت کا جویا ہوں لیکن میرا جام شکستہ ہے اس جام میں تھوڑا بہت تو مل ہی جائے گا۔

۲۳۔ پیچیدہ بہ خود چو موج دریا
آوارہ چو گرد باد صحرا

میں موج دریا کی مانند خود اپنے ہی سے الجھ رہا ہوں اور صحرا کی ہوا کی طرح آوارہ پھر رہا ہوں یعنی کہیں منزل نظر نہیں آتی کہیں ٹھکانا دکھائی نہیں دیتا، ساحل کا دور دور تک پتا نہیں ہے جس طرح سمندر کی لہریں خود آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اسی طرح میں بھی ساحل کی تلاش میں ٹکرا رہا ہوں اور بادِ صحرا کی طرح ہر طرف اڑا جا رہا ہوں۔

۲۴۔ واماندہ ز ردِ نارسیدن
در آبلہ شکستہ دامن

میں اپنی منزل کو حاصل نہ کر سکا اور منزل مقصود تک پہنچ نہ سکا اس لیے مجھ پر تھکن کے آثار نمایاں ہیں چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ چکے ہیں اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے میرا دامن بھی شکستہ ہو چکا ہے۔

۲۵۔ عشق تو دلم ربود ناگاہ
از کار گرہ کشود ناگاہ

ابھی میں اسی کیفیت میں گرفتار اور اپنی نارسائی پر شکستگی سے دوچار تھا کہ اے میرے مولا علی آپ کے عشق نے میرے دلِ حیراں کو ایک دم اچک لیا اور میرے ذہن فکر اور فہم کی الجھی ہوئی گرہوں کو یکایک کھول دیا میری ساری الجھنیں دور ہو گئیں پریشانیاں ختم ہو گئیں، حیرانیوں کے بادل چھٹ گئے مجھے منزلِ مقصود مل گئی اور میں نے اپنے مطلوب کو پا لیا۔

۲۶۔ آگاہ ز ہستی و عدم ساخت
بت خانۂ عقل را حرم ساخت

مولا علی نے مجھے وجود و عدم سے آگاہ کر دیا اور فلسفۂ ہست و نیست میرے ذہن و دل کو سمجھا دیا اور مجھے بود و نہ بود سے واقف کر دیا اور مجھے میرے رب سے ملا دیا اور میرے ذہن میں جو وسوسے گردش کر رہے تھے اور عقل ششدر و حیراں ہو کر ہر مذہب و ملت اور دین و آئین کا جائزہ لے رہی تھی اور حق و صداقت کی تلاش میں حیران و سرگرداں تھی اور میں نے اپنے ذہن و دل میں طرح طرح کے بتوں کو سجا رکھا تھا جب میری عقل میں میرے مولا کی محبت کے نقوش ابھرے اور ان کے ہاتھوں نے میرے دل کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور مجھے اپنا بنا لیا تو پھر وسوسے اوہام، ایہام، ابہام، شک اور تردد کے سارے بت گر گئے اور میری عقل کا بت خانہ خانۂ کعبہ بن گیا، اور میں نے ''لا'' سے الا اللہ تک کا سفر طے کر لیا۔

۲۷۔ چوں برق بہ خرمنم گزر کرد
از لذتِ سوختن خبر کرد

علی کا عشق ایک بجلی تھی جو میرے خرمنِ حیات کے پاس سے گزر گئی اور مجھے عشق میں جلنے کی لذت سے آشنا کر گئی یعنی مجھے حیات کے رموز کا شناسا بنا دیا۔

حضرت علی کی محبت کو برق سے تشبیہ دی ہے اور اپنے دل کو اور اپنی عقل کو خرمن کے مانند کہا ہے اور محبت میں جو سوزش ہوتی ہے اسے لذت سے تعبیر کیا ہے میں جب تک حضرت علی کی ذات تک نہیں پہنچا تھا مجھے اس لذت سے ناآشنائی تھی لیکن میرے مولا نے مجھے اس لذت

اور لطف سے آشنا کیا ہے دراصل شمع و پروانے کی محبت ضرب المثل ہے، پروانہ جو شمع کے گرد چکر لگاتا ہے وہ اس پر قربان ہو جانے ہی کو اپنی زندگی سمجھتا ہے اقبال فرماتے ہیں میری مثال بھی اس پروانے کی سی ہے جو اس شمع امامت پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔

۲۸۔ بر باد متاعِ ہستیم داد
جائے زمئے حقیقتم داد

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میری زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی میں جس راستے کا راہی تھا میری حیات نے جن چیزوں کو اپنایا اور زندگی کا معمول بنایا تھا وہ میری ہستی اور ذات کو تباہی کی طرف لے جا رہی تھی اس لیے جب سے میرے مولا میری زندگی میں آئے تو انھوں نے میری متاعِ ہستی کو ہوا میں اڑا دیا اس ہستی کو بدل کر رکھ دیا اور دوسری حیات جو حقیقی زندگی کہلانے کی مستحق ہے مجھے اس سے روشناس کرایا انھوں نے مجھے صحیح، درست اور اصلی زندگی کی شراب پلا دی۔

۲۹۔ سرمست شدم زپا فتادم
چوں عکس زخود جدا فتادم

میں مدہوش ہو کر گر پڑا ہوں اور اپنے سائے کی طرح خود سے جدا ہو گیا ہوں۔ علامہ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ جب سے میں نے محبت علی کی شراب پی لی ہے مجھ پر مدہوشی کی ایسی کیفیت طاری ہے کہ میں خود اپنے قابو میں نہیں ہوں اور بے قابو ہو کر زمین پر سجدہ ریز ہو رہا ہوں جس طرح انسان کا عکس اس کے وجود سے جدا ہوتا ہے حالانکہ اسی شے کا عکس ہوتا ہے میں بھی سائے کی طرح خود سے جدا ہو گیا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو خود سے جدا کر کے محبوب میں ضم کر دیا ہے۔

۳۰۔ پیراہن ما و من دریدم
چوں اشک زچشم خود چکیدم

میں نے ''ما'' اور ''من'' کے لباس کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور آنسو کی مانند میں اپنی آنکھ

سے لپک رہا ہوں۔ ''ما'' کے معنی ہم اور من کے معنی ''میں''

معاشرے میں سب سے بڑی خرابی اور انسان کی بڑی تباہی لفظ ''ما'' و ''من'' ہے ''انا'' نے ہر فرد، ہر شخص، ہر انسان کو غرور، تکبر، بڑائی اور عجب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

انسان کا اس حصار سے باہر نکلنا بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے، انا کو فنا کر دینا دلیل شرافت و کیاست ہے جو اپنی انا کو فنا کر دیتا ہے وہ بقا کا مسافر بن جاتا ہے، ہم جب تک ما و من کے لباس کو چاک نہیں کریں گے اور اسے اپنے تن سے جدا نہیں کریں گے کامیابی سے ہم کنار نہ ہوں گے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت علی کی محبت ان کی الفت اور ان کی چاہت نے میرے ذہن، فکر، فہم، عقل، شعور اور ادراک میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے، میں جو ''انا'' کی قید میں گرفتار تھا اور میں نے انانیت کا جو لباس زیب تن کر رکھا تھا وہ مولا علی کی قربت اور معرفت کی وجہ سے اتار کر پھینک دیا اسے پارہ پارہ کر دیا اور میں آنسو بن کر خود اپنی ہی آنکھ سے ٹپکنے لگا جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

☆☆☆☆☆

اے خاکم بہ فراز عرش بردی
زاں راز کہ با دلم سپردی

اے میرے مولا تو نے میری خاک کو عرش کی بلندیوں پر پہنچا دیا اس راز کی وجہ سے جو تو نے میرے دل کے سپرد کر دیا ہے۔

میں اصل میں خاکی تھا'' خاک سے میرا پیوند ہے اور تقاضائے خاک یہی ہے کہ میں زمین پر زندگی بسر کروں، خاکی مخلوق طاقت پرواز نہیں رکھتی جو بلندی تک پہنچے اور منازل افلاک کو طے کرے لیکن اے میرے مولا آپ نے جو راز میرے دل کے سپرد کیا ہے اس کی

وجہ سے آپ نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے آپ خود علی ہیں لہٰذا آپ نے مجھے بھی علو مرتبت بنا دیا ہے۔

۳۲۔ واصل بہ کنار کشتیم شد
طوفان جمال زشتیم شد

میری کشتی جو بھنور میں گھری ہوئی تھی اور ساحل تک پہنچنا چاہتی تھی میرے مولا آپ کی محبت والفت سے اب میری کشتی کنارے لگ گئی ہے اسے ساحل میسر آ گیا ہے۔

اور میری تمام خرابیاں، خامیاں اور برائیاں' اچھائیوں اور خوبیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور طوفان جمال کے حلقے میں آ گئی ہیں یعنی میرے لیے طوفان بلا طوفان جمال میں تبدیل ہو گیا ہے جو محبتوں، الفتوں اور چاہتوں کا طوفان ہے اسی میں میری نجات کامیابی اور صلاح وفلاح پوشیدہ ہے، حضرت علی سے ملاقات اور ان کی محبت والفت کی وجہ سے میں طوفان بلا سے نجات پا کر طوفان جمال کی سرحدوں میں آ گیا ہوں اور میری کشتی حیات اور سفینہ زندگی جو بھنور میں پھنسی ہوئی تھی اسے الفت ومحبت کے تھپیڑوں نے منزل مقصود تک پہنچا دیا ہے۔

۳۳۔ جز عشق حکایتی ندارم
پروائے ملامتے ندارم

میں سوائے عشق اور محبت کے کوئی اور داستان نہیں رکھتا یعنی میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی قصہ اور داستان نہیں ہے اور مولائے کائنات سے مجھے جو الفت اور محبت ہے اس بارے میں مجھے کسی کی ملامت اور سرزنش کی کوئی پروا نہیں ہے۔

لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ

اللہ والے کسی بھی ملامت کی پروا نہیں کرتے۔

۳۴۔ از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم، گریم، تپم، گدازم

آپ کے علم کے جلوے نے مجھے ہر ایک سے بے نیاز کر دیا ہے میں آتش عشق میں

جل رہا ہوں، میں فراق میں آنسو بہا رہا ہوں، میں حرارت عشق کی تپش محسوس کر رہا ہوں اور میں شمع کی طرح پگھل رہا ہوں۔ایک عاشق کے لیے جو صفات ہونی چاہیے علامہ اقبال نے چار صفتوں کا ذکر کیا ہے پہلی صفت کا اظہار ''سوزم'' سے کیا ہے اور دوسری صفت ''گریم'' کو قرار دیا ہے اور تیسری صفت کا اظہار ''تپم'' سے کیا ہے اور چوتھی صفت ''گدازم'' کو بیان کیا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت علی سے شناسائی کے بعد اب مجھے دنیا جہان کا کوئی علم متاثر نہیں کرسکتا، میں حضرت علی کی محبت والفت سے سرمست ہو کر اغیار کے علوم وفنون سے بے نیاز ہو چکا ہوں اب میرا رابطہ علم کے اس سرچشمے سے ہے جو علم لدنی سے سرشار ہے، جو ''وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ'' کا مصداق ہے۔جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اگر ہم علامہ اقبال کی فکر کا مطالعہ کریں اور اسے پیش نظر رکھیں اور مشہور نظم جس کا عنوان ہے درشرح اسرار اسمائے علی مرتضیٰ اس کے پہلے شعر

مسلم اول شہ مرداں علی
عشق را سرمایۂ ایماں علی

پر غور کریں تو علامہ اقبال کے نزدیک مولا علی کی ذات عشق کا سرمایہ ہے۔علامہ اقبال نے مختلف مقامات پر علم و عشق کا موازنہ کیا ہے بالخصوص ان کی ایک نظم ''علم وعشق بھی ہے'' جو ضرب کلیم کے ص ۳۲ پر موجود ہے وہ فرماتے ہیں۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

☆☆☆

بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب

علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُمّ الکتاب

ان اشعار کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک علم تخمین وظن ہے، علم مقام صفات ہے، علم پیدا سوال ہے علم ابن الکتاب ہے۔ علامہ اقبال کی فکر میں عشق کو علم پر جو فوقیت حاصل ہے ان کے نزدیک جو شخص عشق کی منزلیں طے کر لیتا ہے پھر اُسے علم کی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم، گریم، تپم، گدازم

☆☆☆

در شرحِ اسرارِ اسمائے علیِ مرتضیٰ

مسلمِ اوّل شہِ مرداں علی
عشق را سرمایۂ ایماں علی

از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

نرگسم وارفتۂ نظارہ ام
در خیابانش چو بو آوارہ ام

زمزم ار جوشد ز خاکِ من ازوست
مے اگر ریزد ز تاکِ من ازوست

خاکم و از مہرِ او آئینہ ام
می تواں دیدن نوا در سینہ ام

از رخِ او فالِ پیغمبر گرفت
ملّتِ حق از شکوہش فر گرفت

قوّتِ دینِ مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

مرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در امّ الکتاب

ہر کہ دانائے رموزِ زندگیست
سرِّ اسمائے علی داند کہ چیست

خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است
عقل از بیدادِ او در شیون است

قہرِ گردوں رس زمیں پیما ازو
چشمِ کور و گوشِ ناشنوا ازو
از ہوس تیغِ دو رو دارد بدست
رہرواں را دل بریں رہزن شکست
شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد
ایں گِلِ تاریک را اکسیر کرد
مرتضیٰ کز تیغِ او حق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است
مردِ کشورگیر از کراری است
گوہرش را آبرو خودداری است
ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
بازگرداند ز مغرب آفتاب
ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست
چوں نگیں بر خاتمِ دولت نشست
زیرِ پاش ایں جا شکوہِ خیبر است
دستِ او آں جا قسیمِ کوثر است
از خود آگاہی یداللّٰہی کند
از یداللّٰہی شہنشاہی کند
ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم
زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم
حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش
تا مے روشن خوری از تاکِ خویش

خاک گشتن مذہب پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است
سنگ شو اے ہمچوگل نازک بدن
تاشوی بنیاد دیوار چمن
از گِل خود آدمے تعمیر کن
آدمے را عالمے تعمیر کن
گر بنا سازی نہ دیوار و درے
خشت از خاک تو بندد دیگرے
اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ
جام تو فریادیٔ بیداد سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا
سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمون حیات
لذت تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاق جہان تازہ شو
شعلہ در بر کن خلیلِ آوازہ شو
باجہاں نامساعد ساختن
ہست در میداں سپر انداختن
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
بامزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد بامزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

بر کند بنیاد موجودات را
می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہماتِ عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکنات قوتِ مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار
حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوت پیدا ستے
اصلِ او از ذوقِ استیلاستے
عفو بیجا سردیِ خونِ حیات
سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات
ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است
از مکارم اندرون او تہی است
شیرش از بہر ذمائم فربہی است
ہوشیار! اے صاحب عقل سلیم
در کمینہا می نشیند ایں غنیم
گر خردمندی فریب او مخور
مثل حربا ہر زماں رنگش دگر
شکل او اہل نظر نشناختند
پردہ ہا بر روئے او انداختند
گاہ اورا رحم و نرمی پردہ دار
گاہ می پوشد ردائے انکسار
گاہ او مستور در مجبوری است
گاہ پنہاں در تہِ معذوری است
چہرہ در شکل تن آسانی نمود
دل ز دست صاحب قوت ربود
با توانائی صداقت توأم است
گر خود آگاہی ہمیں جام جم است
زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرح رمز حق و باطل قوت است
مدعی گر مایہ دار از قوت است
دعوے او بے نیاز از حجت است

باطل از قوت پذیرد شان حق
خویش را حق داند از بطلان حق
از کن او زھر کوثر می شود
خیر را گوید شرے شر می شود
اے ز آداب امانت بے خبر!
از دو عالم خویش را بہتر شمر!
از رموز زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو
چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہ حق بر من بخند

در شرح اسرار اسمائے علی مرتضیٰ

علی المرتضیٰ کے ناموں میں پنہاں رازوں کی تشریح۔

یہ نظم علامہ اقبال کی کتاب مثنوی اسرار خودی میں ہے جس میں ۱۵۹ اشعار ہیں، یہ کتاب کے ص ۵۲ سے شروع ہو کر ص ۷۵ تک ہے

۱۔ مُسلم اوّل شہ مرداں علی
عشق را سرمایۂ ایماں علی

سب سے پہلے مسلمان، بہادروں کے بادشاہ علی اور عشق کے لیے ایمان کا سرمایہ علی ہیں، ویسے تو حضرت علی حضرت ابراہیم کی ملت کے پیروکار تھے اور اس خانوادے کے فرد تھے جس کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (سورۂ بقرہ ۲: ۱۲۸)

پروردگارا! تو مجھے اور اسماعیل کو اپنا مسلمان بنا اور ہماری ذریت اور خاندان میں ایک

ایسی اُمت پیدا کرتا رہ جو مسلمان ہو لہذا اس آیت کی رو سے حضرت علی پیدائشی طور پر مسلمان تھے انھوں نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا تھا، لیکن تاریخی اعتبار سے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو مردوں میں جس نے سب سے پہلے اس آواز پر لبیک کہی ان کا نام نامی اور اسم گرامی علی ابن ابی طالب ہے علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء ص ۱۲۸ پر رقم طراز ہیں:

انه اول من اسلم ونقل بعضهم الاجماع علیه

حضرت علی ہی پہلے مسلم ہیں اور کچھ محدثین نے نقل کیا ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔

علامہ اقبال یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ عشق ومحبت اور الفت وچاہت کے لیے جو ایمان کا سرمایہ ہے وہ صرف اور صرف ذات علی ابن ابی طالب ہے۔ انھی سے میں نے یہ سرمایہ اور یہ پونجی حاصل کی ہے اور غالباً اس حدیث کی اشارہ ہو جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

یَا عَلِی حُبُّكَ اِیْمَانٌ وَبُغْضُكَ نِفَاق۔

اے علی! آپ کی محبت ایمان ہے اور آپ کا بغض نفاق۔

اور دوسری حدیث میں فرمایا:

بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّهٖ

مکمل ایمان مکمل کفر کے مقابل میں جارہا ہے۔

۲۔ از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثل گہر تابندہ ام

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں حضرت علی علیہ السلام کے خاندان کی محبت کے سبب زندہ ہوں اور دنیا میں گوہر کی مانند روشن اور چمک دار ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام کے خاندان سے مراد امام حسن وحسین علیہما السلام اور ان کی نسل میں آنے والے ائمہ ہیں یعنی اہل بیت۔ ان کی محبت کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرض قرار دیا

ہے۔ جب آیت

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى" (سورہ الشوریٰ ۴۲: ۲۳ نازل ہوئی)

"اے پیغمبر! آپ فرما دیجیے کہ میں تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتا مگر یہ ہے کہ میرے قرابت داروں سے مودت رکھو۔" لوگوں نے دریافت کیا کہ يَا رَسُولَ اللهِ مَنْ قَرَابَتُكَ الَّذِيْنَ وَجَبَتْ عَلَيْنَا مَوَدَّتُهُمْ قَالَ هُمْ عَلِيٌّ وَ فَاطِمَةُ وَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ۔

وہ آپ کے کون سے قرابت دار ہیں جن کی مودت ہم پر فرض کی گئی ہے تو آنحضرتؐ نے فرمایا وہ علی، فاطمہ، حسن اور حسین ہیں۔

۳۔ نرگسم وارفتۂ نظارہ ام
در خیابانش چو بو آوارہ ام

میری مثال گل نرگس کی سی ہے۔ میں نظارے پر مرمٹا ہوں اور اُن کے خیابان میں خوشبو کی طرح ہر طرف چکر لگا رہا ہوں۔ میں حضرت علیؑ کا دیوانہ اور مستانہ ہوں۔

عموماً شعرا نرگس کے پھول کو موضوع سخن بناتے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۴۔ زمزم ار جوشد ز خاکِ من ازوست
مے اگر ریزد ز تاکِ من ازوست

علامہ اقبال نے استعارے کی زبان استعمال کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری خاک سے اگر زمزم جیسا چشمہ جاری ہوا ہے تو یہ انھی کی ہستی کا فیضان ہے اور میرے انگور سے اگر شراب جلوہ دکھا رہی ہے تو یہ بھی انھی کا لطف و کرم ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ زمین شعر و سخن سے جو شاعری کا زمزم موجزن ہے وہ سب میرے مولا کا کرم ہے۔ یعنی میری شاعری کا جوش و خروش، جذبہ اور ولولہ، معانی و مفاہیم یہ سب ان کی دین ہے۔ دوسرے مصرعے میں

شراب کی تلمیح ہے اس لیے کہ اکثر شراب کو انگور سے کشید کیا جاتا ہے لہٰذا وہ فرماتے ہیں کہ میرے اشعار کی سرمستی اور سرخوشی یہ سب حضرت علی علیہ السلام کا فیض اور ان ہی کی عنایت ہے۔

۵۔ خاکم و از مہر او آئینہ ام
می تواں دیدن نوا در سینہ ام

اگرچہ میں خاک ہوں لیکن ان کی چشم کرم کی وجہ سے ان کی محبت والفت کا آئینہ ہوں اور اگر تم دیکھ سکو تو انہی کی آواز میرے سینے اور میری سانسوں میں ہے۔

۶۔ از رخ او فال پیغیبر گرفت
ملت حق از شکوہش فر گرفت

ان کے رُخ روشن کی زیارت کو پیغیبر اکرم نے فالِ نیک قرار دیا ہے۔

یعنی ان کے رخ زیبا کو دیکھنا سود مند اور باعث برکت سمجھا ہے اقبال کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْهِ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عِبَادَةٌ۔

یعنی مولا علیؑ کے چہرۂ اقدس کی زیارت عبادت ہے۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں کہ ملتِ حق، ملتِ اسلام نے علی کے شکوہ سے شان وشوکت اور کر وفر حاصل کیا ہے جب رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کی ولادت کے بعد انہیں گود میں لے کر پہلی مرتبہ ان کے چہرے پر نظر کی تھی تو ان کے چہرے کو اسلام کی شان وشوکت اور دین کی فتح ونصرت کے لیے فالِ نیک قرار دیا تھا۔

۷۔ قوتِ دینِ مُبین فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

حضرت علی علیہ السلام کے فرامین اور فرمودات دینِ مبین کی قوت وطاقت ہیں۔ علامہ اقبال اس مصرع میں حضرت علی علیہ السلام کے کلام کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں اس لیے کہ

کلام الامام امام الکلام ہے۔ جسے چوتھی صدی ہجری میں نہج البلاغہ کے نام سے سید رضی متوفی 406ھ نے جمع کیا اور پھر سو سال بعد عبدالواحد آمدی متوفی 550ھ نے مولائے کائنات کے اقوال کا ایک مجموعہ غرر الحکم اور درر الکلم کے نام سے مرتب فرمایا جس میں اقوال امام علیؑ کی تعداد 11,192 ہے۔ شرح ابن ابی الحدید معتزلی میں اور البیان والتبیین میں بھی امام کے اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ نیز اس کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں جو اقوال کے مجموعے ہیں زیور تحریر سے آراستہ ہوئیں۔

۸۔ مرسل حق کرد نامش بوتراب
حق ید اللہ خواند در ام الکتاب

اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کا نام ابوتراب رکھا تھا اور آپ اس کنیت کے ساتھ پکارے جاتے تھے اور آپ کو یہ نام محبوب اور پسندیدہ تھا۔ ابوتراب کے معنی ہیں مٹی کے باپ۔ اس کنیت کے بارے میں محمد بن اسماعیل بخاری رقم طراز ہیں۔

ایک شخص نے سہل بن سعدؓ سے کہا، فلاں شخص علی علیہ السلام کو دشنام دے رہا ہے۔ پوچھا گیا کہہ رہا ہے کہا ابوتراب کہہ رہا ہے تو سہل بن سعدؓ ہنس دیے اور کہا خدا کی قسم! ان کا یہ نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا ہے اور خود حضرت علی علیہ السلام کو بھی یہ نام سب سے زیادہ پسند تھا۔ میں نے دریافت کیا اے ابو عباس! یہ نام کیسے رکھا گیا؟ تو انھوں نے جواب دیا۔ حضرت علی علیہ السلام فاطمہ سلام اللہ علیہا کے پاس گئے اور پھر وہاں سے آ کر مسجد میں سو گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے دریافت کیا کہ میرے ابن عم کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ مسجد میں۔ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ان کی چادر پشت سے ہٹ گئی ہے اور مٹی کو چھو رہی ہے تو آنحضرت ﷺ نے تراب کو ان کی پشت سے پونچھنا شروع کر دیا اور فرمایا: اِجْلِسْ یَا اَبَا تُرَاب۔ دو مرتبہ ایسا کہا۔ اے ابوتراب اٹھو! اے ابوتراب اٹھو۔

(حدیث نمبر 3703 صحیح بخاری شریف)

۹۔ ہر کہ دانائے رموز زندگیست
سرِّ اسمائے علیؑ داند کہ چیست

جو شخص بھی زندگی کے راز و رموز سے آشنا ہے، وہ جانتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے ناموں میں کون کون سے رموز مخفی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے بہت سے نام ہیں جو ان کی مختلف صفات کے مظہر ہیں۔ ماں نے نام حیدر رکھا تھا جس کے معنی ہیں شیر۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے علی نام تجویز کیا گیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوتراب کے نام سے پکارا۔

۱۰۔ خاک تاریکے کہ نام اوتن است
عقل از بیداد او در شیون است

یہ تاریک خاک جس کو جسم کہتے ہیں، عقل اس کی بیداد (نادانی اور ظلم وستم) کے سبب گریہ وشیون کر رہی ہے۔

اقبال نے اس شعر میں جسم کو جو فانی ہے اور مٹی سے بنا ہے، اس کی غفلتوں کے سبب خاک تاریک کا نام دیا ہے۔ قرآن کریم نے تخلیق انسانی پر گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ انھیں مٹی سے خلق کیا ہے۔ "خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ"، "مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ"، "مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ"، "مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ"، "مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ"۔ جسم کے تقاضے، خواہشات نفسانی اور حرص و ہوس ہے، جتنی برائیاں ہیں سب اسی سے جنم لیتی ہیں لہٰذا عقل اس کی بیداد پر شور وغوغا کر رہی ہے۔

۱۱۔ فکر گردوں رس زمیں پیما ازو
چشم کور و گوش ناشنوا ازو

وہ فکر جو آسمانوں تک رسائی حاصل کرنے والی ہے اس تن خاکی کے سبب زمین کی پستی میں رہ گئی ہے اور اس کی پرواز میں کوتاہی آ گئی ہے۔ وہ بجائے صعود کے ہبوط کرنے لگتی ہے، اس کی اڑان ختم ہو گئی ہے۔ کثافت اسے زمین کی جانب کھینچتی ہے اور وہ صرف زمین کا ہو کر رہ

جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی بینائی اور سماعت متاثر ہوگئی ہے۔ وہ اشیاء کی گہرائیوں تک نہیں دیکھ سکتا ہے اور نصیحت کی آوازوں کو نہیں سنتا۔ اس کا مطمحِ نظر صرف اور صرف تن پروری رہ گیا ہے اور اس کی تمام تر تگ و دو صرف اسی کام کے لیے محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

۱۲۔ از ہوس تیغ دو رو دارد بدست
رہرواں را دل بریں رہزن شکست

یہ تن حرص و آز اور طمع و لالچ کی دو دھاری تلوار ہاتھ میں لیے ہے۔ جو مسافر بھی اس راہ سے گزرتا ہے تو یہ لٹیرا راہِ حیات کے مسافروں کے دل یعنی ہمت اور حوصلوں کو شکستہ کیے ہوئے ہے۔

۱۳۔ شیرِ حق این خاک را تسخیر کرد
این گلِ تاریک را اکسیر کرد

شیرِ حق نے اس خاک کو مسخر کر لیا ہے وہ اس تن پر حاکم ہیں اور یہ تن ان کا محکوم ہے اور انھوں نے اس تاریک مٹی کو اکسیر بنا دیا ہے۔

اس شعر میں شیرِ حق سے مراد علی مرتضیٰ علیہ السلام ہیں کیوں کہ ان کا لقب اسد اللہ ہے۔ جس کا ترجمہ شیرِ حق ہے۔

جیسا کہ سورہ مدثر میں کافروں کے بارے میں ارشاد ہوا۔ (۵۱ المدثر ۷۴) گویا کہ وہ بدکائے ہوئے گدھے ہیں جو قسورہ (شیر) سے راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں اور یہ لفظ قسورہ حضرت علی علیہ السلام نے استعمال کیا تھا جب مرحب کے جواب میں شعر پڑھا تھا۔

انا الذی سمتنی اُمّی حَیدَرہ
ضرغام آجامٍ وَلَیثٌ قسوَرَہ

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدرہ (شیر) رکھا ہے۔

حَیدَرہ، ضرغام، لیث اور قسورہ سب شیروں کے نام ہیں۔

۱۴۔ مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است

حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام جن کی تلوار نے حق وصداقت کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ حق انھی کی کوششوں اور کاوشوں سے روشن ہے۔ ان کا مشہور نام ابوتراب اسی لیے ہے کہ علیؑ نے اقلیم تن جو مٹی سے بنا ہے اسے تسخیر کرلیا ہے۔

علامہ اقبال نے نہایت لطیف پیرائے میں "بوتراب از فتح اقلیم تن است" کے ذریعے حضرت علی علیہ السلام کی قوت وطاقت کا تذکرہ کیا ہے۔ اصل بہادری اور شجاعت میدانِ جنگ میں دشمنوں کو زیر کرنا اور پچھاڑنا نہیں ہے بلکہ حقیقی شجاعت اقلیم تن کو شکست دینا ہے اور اس پر فتح یابی حاصل کرنی ہے۔ یہ کالبدِ خاکی یہ جسدِ خاکی خواہشات، آرزوؤں، تمناؤں اور آشاؤں کا مرکز ہے۔ اسے خواہشات سے روکنا جہادِ اکبر ہے۔

ارشادِ ربّ العزت:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰىؕ (سورۃ النازعات ۷۹: ۴۰۔۴۱)

اور جس نے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف رکھا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا۔ تو یقیناً جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے اور ان کے ساتھ ان کے صحابہ کرامؓ تھے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ وَبَقِیَ عَلَیْنَا الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ۔ ہم جہادِ اصغر سے واپس آگئے اور ہم پر ابھی جہادِ اکبر باقی ہے۔ لوگوں نے سوال کیا۔ مَا الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ۔ جہادِ اکبر کیا ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اَلْجِهَادُ بِالنَّفْسِ۔ نفس سے جہاد کرنا۔

۱۵۔ مرد کشورگیر از کراری است
گوہرش را آبرو خودداری است

حضرت علی علیہ السلام وہ مردِ میدان ہیں کہ جنھوں نے اپنی صفتِ کراری یعنی بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے کی وجہ سے ملکِ تن کو فتح کیا ہے۔ اسلام میں دورِ رسالت کی جتنی غزوات اور

سرایا ہیں ان سب میں حضرت علی علیہ السلام کا کردار نمایاں ہے۔

دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں یہ کراری وہ گوہر آبدار اور درخشاں ہے جس کی آبرو اور عزت خودداری کی وجہ سے ہے۔

اقبال کا فلسفۂ خودی ہمہ جہت اور بہت وسیع ہے وہ مختلف مقامات پر اسے اپنے اشعار میں ذکر کرتے ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
خودی ہے زندہ تو ہے موت، اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بے کرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل وفرات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہِ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

(ارمغانِ حجاز ۲۲ے)

۱۶۔ ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

اس شعر کے لفظی معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو (آفاق) اس دنیا میں بوتراب یعنی فاتح اقلیم تن ہو جائے وہ سورج کو مغرب سے پلٹا سکتا ہے۔ ان معنوں میں ہر چند کہ ایک امکانی صورت حال نظر آتی ہے مگر یہ حضور اکرم ﷺ کا معجزہ ہے جو دہرایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے اور اس نظم کے دیگر اشعار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علی چوں کہ ابوتراب اور فاتح اقلیم تن تھے یعنی اپنی خواہشات وضروریات پر مرضی خدا اور ذات رسول خدا ﷺ کو ترجیح دیتے تھے اس لیے انھوں نے مغرب میں ڈوبے ہوئے آفتاب (سورج) کو پلٹا دیا۔ ردّ الشمس ایک اہم تاریخی

واقعہ ہے اس لیے قارئین کی دل چسپی اور معلومات کے لیے ہم اسے ذرا تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سورج حضرت علی علیہ السلام کے لیے دو مرتبہ پلٹا۔ ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر اور دوسری مرتبہ جنگِ نہروان سے واپسی پر اور حدیث ردِّ شمس متواتر ہے۔ بہت سے علماء نے اس موضوع پر جداگانہ کتابیں تحریر کی ہیں جن میں علامہ جلال الدین سیوطی نمایاں ہیں۔

یہ حدیث ام المومنین حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے دو طرح سے وارد ہوئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر وحی کا سلسلہ جاری تھا اور ان کا سرِ اقدس حضرت علی علیہ السلام کے زانو پر تھا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا۔ أَصَلَّيْتَ يَا عَلِيُّ! اے علی! کیا آپ نے نماز پڑھ لی۔ انھوں نے فرمایا نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّهُ كَانَ فِي طَاعَتِكَ وَطَاعَةِ رَسُولِكَ فَارْدُدْ عَلَيْهِ الشَّمْسَ۔

اے اللہ! علی یقیناً تیری اور تیرے رسول کی اطاعت کر رہے تھے۔ تو ان کے لیے سورج کو پلٹا دے۔

اسماءؓ کہتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد پلٹ آیا اور پہاڑوں پر نظر آیا اور یہ صہباء کے مقام پر خیبر میں تھا۔

(تاریخ الخمیس 58/2 مشکل الآثار 11/2)

جب علی علیہ السلام نے نمازِ عصر پڑھ لی تو سورج غروب ہوگیا۔

یعنی رسول اکرم ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی جب کہ حضور اکرم ﷺ حضرت علی علیہ السلام کے زانو پر سر رکھے ہوئے تھے اور یہ امر نبی وخدا کی اطاعت میں تھا دوسرے لفظوں میں کہنا پڑے گا کہ اطاعت خدا اور رسول کے سبب سورج کو پلٹنا پڑا۔

۱۷۔ ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست
چوں نگیں برخاتمِ دولت نشست

جس شخص نے بھی بدن کی سواری پر زین کس لی یعنی تن پر قابو پالیا تو ایسا شخص دولت، حکومت اور سلطنت کی انگوٹھی پر نگینے کی طرح جاگزیں ہوگیا۔

انگوٹھی ملک اور نگ مولا علی کی حکم رانی کا استعارہ ہے۔ یہاں پر ''ہر کہ'' سے حضرت علی علیہ السلام کی ذات کی طرف اشارہ ہے جس کی دلیل اگلا شعر ہے۔

۱۸۔ زیرِ پاش ایجا شکوہِ خیبر است
دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است

اس دنیا میں حضرت علی کے قدموں تلے خیبر کی شان و شوکت، جاہ و جلال روندا جاچکا ہے۔ دوسرے مصرعے میں علامہ اقبال پیروں کے بعد ہاتھوں کا ذکر کر رہے ہیں اُدھر اُن کے ہاتھ یعنی قبضے میں کوثر کی تقسیم کا کام ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور کو کوثر عطا فرمایا: ''اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ''۔ لہٰذا اس آیت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مالکِ کوثر ہیں اور انھوں نے کوثر کی سقایت اور پانی پلانے کا کام حضرت علی علیہ السلام کے ذمے لگایا ہے۔ لہٰذا حضرت علی علیہ السلام کا ایک لقب ساقی کوثر بھی ہے۔

اساتذہ شعراء نے یہ لقب اپنے اشعار میں بار بار نظم کیا ہے۔ غالب کا شعر ہے

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

☆☆☆

۱۹۔ از خود آگاہی ید اللٰہی کند
از ید اللٰہی شہنشاہی کند

حضرت علی علیہ السلام کی ہستی ایسی ہے جو خود آگاہی یعنی اپنی معرفتِ نفس کی بنیاد پر دستِ قدرت کے کام انجام دیتے ہیں اور وہ ید اللٰہی (دستِ خداوندی) کے ذریعے شہنشاہی

کر رہے ہیں۔

اس شعر میں جو لفظیں استعمال ہوئی ہیں وہ "خود آگاہی" "یداللّٰہی" اور شہنشاہی ہیں۔

خود آگاہی یعنی معرفتِ نفس حدیث کے الفاظ ہیں۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین سے منقول ہے۔ جس شخص نے خود کو پہچان لیا گویا کہ اس نے خدا کو پہچان لیا۔ یعنی خود شناسی خدا شناسی ہے۔ علامہ اقبال نے خودی اور خود شناسی پر بڑا زور دیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جب باب خیبر کو اکھاڑا تھا تو فرمایا: مَا قَلَعْتُ بَابَ خَيْبَرَ بِقُوَّةٍ جِسْمَانِيَّةٍ بَلْ قَلَعْتُهٗ بِقُوَّةٍ رَبَّانِيَّةٍ۔ میں نے باب خیبر کو جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ قوتِ ربانی سے اکھاڑ پھینکا تھا۔

۳۰۔ ذات او دروازۂ شہر علوم
زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

یہ شعر سابقہ شعر سے متصل ہے۔ حضرت علی علیہ السلام شہر علوم کا دروازہ ہیں اور حجاز (مکہ و مدینہ) چین اور روم سب آپ کے زیر نگیں ہیں۔ ان کے حکم کے تابع ہیں۔ یعنی جہاں جہاں علم پہنچا ہے اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے وہ سب حضرت علی علیہ السلام کے علم کا رہین منت ہے۔

۳۱۔ حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش
تا مے روشن خوری از تاکِ خویش

اپنی خاک پر حکمران بن جانا چاہیے تاکہ تم اپنے ہی انگور سے روشن اور دین کو جلا دینے والی شراب پی سکو۔

اس شعر میں استعارے کے طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ غالباً اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔ تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

۳۲۔ خاک گشتن مذہبِ پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است

خاک ہوجانا ہی پروانگی یعنی عشق کا مذہب ہے۔ تم خاک کے باپ بن جاؤ یعنی ابوتراب ہوجاؤ کہ یہی مردانگی کا جوہر ہے۔

اس شعر میں علامہ اقبال نے خاک گشتن سے فنا ہوجانا مراد لیا ہے کیوں کہ فنا اُس کی بقا کی دلیل ہے۔ دوسرے مصرے میں فرماتے ہیں کہ تم خاک کے مطیع و معتقد نہ ہو بلکہ ابوتراب ہوکر اقلیم تن خاکی پر فتح حاصل کرو۔

۲۳۔ سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن

تا شوی بنیاد دیوار چمن

علامہ اقبال اس شعر میں یہ تلقین کر رہے ہیں کہ اے پھول کی طرح نازک بدن! اے نازنین! تم اپنے ارادوں اور عزائم میں پختگی حاصل کرو۔ پتھر کی طرح سخت، مضبوط ہوکر "تزولُ الجبالُ ولا تزل" کی تصویر بن جاؤ۔ یہ حضرت علی علیہ السلام کا قول اپنے فرزند محمد حنفیہ سے ہے کہ پہاڑ ہٹ جائیں تو ہٹ جائیں، تمہارے قدموں میں لغزش اور لرزش نہیں آنی چاہیے۔

دوسرے مصرے میں اس مبتدا کی خبر بیان کی ہے تاکہ تم دیوار چمن کی حفاظت کے لیے پتھر کی دیوار بن سکو۔

۲۴۔ از گل خود آدمے تعمیر کن

آدمے را عالمے تعمیر کن

شعر کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ اقبال کہہ رہے ہیں کہ اے بندۂ خاک تو اس مٹی سے ایک آدم بنا اور اس آدم کے لیے ایک عالم تعمیر کر۔ اقبال دراصل یہ سمجھا رہے ہیں کہ اے انسان تجھے خاک سے اس لیے نہیں بنایا گیا کہ تو دنیا میں آکر اک عمر گزار پھر خاک میں مل جائے بلکہ خاک میں جو تخلیقی صلاحیتیں ہیں ان کو بروئے کار لا جیسے مٹی میں ایک دانہ بوتے ہیں تو درخت بن کر نکلتا ہے جس سے بندۂ خدا فیض اٹھاتے ہیں اور یہ فیض مسلسل ایک عالم تعمیر کرتا ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام نے ہمارے لیے یہ عالم تعمیر کیا جس میں ہم آج سانس لے رہے ہیں

ایسے ہی ہم پر آیندہ نسلوں کی تعمیر لازم ہے۔ آدم تعمیر کرنے سے مراد آدمی کی تعمیر نہیں بلکہ اس کے کردار کی تعمیر ہے اسے عالم کے لیے فیض رساں بنانے کی سعی ہے۔

۲۵۔ گر بنا سازی نہ دیوار و درے

خشت از خاک تو بندد دیگرے

اگر تم دیوار اور دروازہ خود تعمیر نہ کرو گے تو پھر تمھاری مٹی سے کوئی دوسرا اینٹیں بنانا شروع کردے گا۔ تمھاری محنت برباد ہو جائے گی۔ اگر تم اپنی ملت کی حفاظت نہ کرو گے تو تمھاری اس زمین کو لوگ روند ڈالیں گے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی

لوگوں نے میرے صحن سے رستے بنا لیے

علامہ اقبال غفلت سے بیداری کا درس دے رہے ہیں اور اپنی عظمتِ پارینہ کی حفاظت کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ جینے کا قرینہ اور زندہ رہنے کا سلیقہ بتا رہے ہیں۔

۲۶۔ اے ز جور چرخ ناہنجار تنگ

جام تو فریادی بیداد سنگ

اے وہ شخص جو ناموافق آسمان کے ظلم وجور سے تنگ ہے۔ تیرا جام پتھر کی بیداد یعنی شکستِ جام کا فریادی ہے۔

شعراء کا یہ نظریہ ہے کہ آسمان و زمین چکی کے دو پاٹ ہیں اور انسان ان دونوں کے درمیان پیسا جا رہا ہے اور اس پر آسمان سے ہی ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں لہٰذا علامہ اقبال ہم سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ ہم جو نامساعد حالات سے تنگ ہیں اور ہمارے خیال میں یہ سب کچھ آسمان کا کیا دھرا ہے۔ ہم آسمان پر تو الزام رکھتے ہیں مگر اپنی غفلتوں کو نہیں دیکھتے جن کے سبب ہم برباد ہو رہے ہیں اور صرف آسمان کے خلاف آواز اٹھانے میں مصروف ہیں۔

۲۷۔ نالہ و فریاد و ماتم تا کجا
سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا

نالہ و شیون اور فریاد و ماتم کب تک کرتے رہو گے اور کب تک تم ملول و حزین اور غمگین رو کر سینہ کوبی کرتے رہو گے۔ یہ نالہ و فریاد ختم کرو اور آہ و زاری کے حصار سے نکلو، میدانِ عمل میں آؤ اور حیاتِ نو کا آغاز کرو۔ اٹھو اس لیے کہ:

۲۸۔ در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
لذتِ تخلیق قانونِ حیات

کہا یہ جارہا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے منتظرِ فردا نہ رہو۔ میدانِ عمل میں آؤ، کوشش و کاوش کو اپنا شعار بناؤ، جد و جہد سے کام لو۔ زندگی کا مضمون (نصاب) عمل یعنی جد و جہد میں مخفی ہے اور اس قانون پر عمل پیرا ہونے میں زندگی کی لذتیں موجود ہیں۔ تجدیدِ عمل کامیابیوں کی نوید لذت افزا اپنے ساتھ لائی ہے عمل اور جد و جہد قوموں کو زندہ و پایندہ رکھتی ہے۔ ٹھہر جانا اور رُک جانا جمود و رکود کا باعث اور موت کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں سے نوازا ہے لہٰذا اسے بروئے کار لانا لازمی و لابدی ہے۔

۲۹۔ خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو
شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو

اٹھو اور جہانِ تازہ یعنی نئی دنیا کے خالق بن جاؤ۔ شعلہ کا لباس زیبِ تن کرو اور خلیل کے ہم آواز ہو جاؤ۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں لوگوں کو آمادہ کیا ہے کہ جس طرح خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کے ماحول میں ایک نئی آواز بلند کی، بتوں کو توڑا، بتوں کے طلسم کو توڑا، بت پرستوں کے سامنے دلائل و براہین سے توحید کا پرچار کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے اس زمانے کی سب سے بڑی طاقت نمرود سے ٹکر لی اور اس کی ریشہ دوانیوں کا بھرپور مقابلہ کیا۔ آگ میں کود جانا پسند کیا مگر اعلائے کلمۂ حق سے منہ نہ موڑا۔ جب

انھیں آتشِ نمرود میں ڈالا جا رہا تھا تو پوری کائنات میں ایک ہلچل تھی، ایک اضطراب تھا۔ جبرئیل امین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدد کو تشریف لائے اور اپنی مدد کی پیشکش کی تو خلیل اللہ نے انھیں جواب دیا: أمّا إليكَ فلا۔ مدد تو چاہیے مگر تمھاری مدد درکار نہیں۔ ادھر آواز قدرت آئی: یٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى إِبْرٰهِيْمَ۔ اے آگ! تو ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کو باسلامت رکھ۔

علامہ اقبال نے واقعے کو عشق اور عقل کا موازنہ کرتے ہوئے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

☆☆☆☆

۳۰۔ باجہان نامساعد ساختن
ہست در میداں سپر انداختن

ناموافق زمانے کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اس کے سامنے جھک جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی میدانِ حرب وضرب میں سپر ڈال دے اور شکست کو تسلیم کرلے۔

علامہ اقبال کی فکر اور ان کا فلسفہ یہ ہے کہ:

زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

کہ اگر زمانہ تمھاری موافقت نہیں کرتا تو تم زمانے سے برسرِ پیکار ہو جاؤ۔ اس لیے کہ:

حدیثِ بے خبراں ہے کہ تو با زمانہ بساز

یہ بے خبر اور کم آگاہ لوگوں کی باتیں ہیں کہ زمانے کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔ زمانے کے ساتھ ساتھ چلو۔ زمانہ تمھارا حاکم نہیں بلکہ محکوم ہے۔ تمھیں چاہیے کہ زمانے کو اپنی ڈگر پر چلاؤ نہ یہ کہ زمانے کے دھارے میں بہہ جاؤ۔

تم نیا زمانہ تخلیق کرو، نئے صبح وشام پیدا کرو، خود اپنی دنیا بناؤ اور بقول اقبال جو سلطان ٹیپو کی وصیت کے عنوان سے کہا ہے۔

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول

☆☆☆☆

۳۱۔ مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار

وہ خود دار شخص جو آزمودہ کار اور تجربہ کار ہو زمانہ اس کے مزاج میں ڈھل جاتا ہے اور زمانہ اس کے مزاج، طبیعت اور فطرت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ زمانہ اس کے تجربات اور مشاہدات کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط خود داری، خودی اور خود اعتمادی ہے۔

۳۲۔ گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما بے آسمان

اگر وہ دنیا کو وہ اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہیں کرتا اسے اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلاتا دنیا کو اپنا مطیع و منقاد نہیں بناتا تو پھر تو آسمان بھی اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

۳۳۔ بر کند بنیاد موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرات را

وہ شخص موجودات کی بنیاد کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتا ہے اور وہ ذرات کو نئی ترکیب دے کر ایجادات کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ علامہ اقبال ایسے شخص کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں جو زمانے کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے تن بہ تقدیر نہیں ہے اور وہ زمانے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ بلکہ زمانے کو اپنا تابع بناتا ہے۔

۳۴۔ گردشِ ایام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند

وہ شخص زمانے کی گردشوں کو تبدیل کرنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہے۔ وہ زمانے کی رو میں نہیں بہتا۔ وہ نیلے رنگ کے آسمان سے بھی خائف نہیں ہے کہ وہ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑ دے گا۔ جیسا کہ پچھلے شعر نمبر ۲۶ کی تشریح میں بیان کیا جاچکا ہے۔

۳۵۔ می کند از قوتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار

علامہ اقبال ایسے شخص کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ اپنی قوت و طاقت کے بل بوتے پر ایسے زمانے کو تخلیق کرتا ہے جو اس کے ارادوں سے ہم آہنگ اور اس کے لیے سازگار ہو موافق ہو۔ وہ اپنے لیے نیا زمانہ تخلیق کرتا ہے اور نئے شب وروز بناتا ہے۔

۳۶۔ در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر تم میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ دنیا میں مردانہ وار زندگی بسر کرو تو پھر بہادروں کی طرح اس سے لڑکر جان دے دینا ہی زندگی ہے۔ یعنی اگر تم میں زمانے سے ٹکرانے اور زمانے کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ تو پھر تمھاری حیات، جان کو جان آفریں کے سپرد کردینے میں ہے۔ یہاں "ہمچو مرداں جاں سپردن" سے مراد امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء واقرباء کی قربانی اور شہادت کی جانب اشارہ ہے۔ جنھوں نے اعلائے کلمۂ حق کے لیے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

۳۷۔ آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہماتِ عظیم

تو جو شخص قلبِ سلیم کا مالک ہے وہ اپنی قوت وطاقت سے عظیم مہمات بڑے بڑے کارنامے انجام دینے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔

ارشادِ رب العزت ہے:

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۝ (سورۃ الشعرا ۲۶: ۸۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فرمایا۔ مگر وہ جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۝ (سورۃ الصافات ۳۷: ۸۴)

جب حضرت ابراہیم اپنے رب کے پاس قلب سلیم کے ساتھ آئے۔ قلب سلیم وہ دل ہے جس میں سلامتی ایمان موجود ہو۔

۳۸۔ عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است

عشق کا کام دشواریوں سے کھیلنا اور مشکلات کا سامنا کرنا ہے۔ یہی کام اسے پسند آتا ہے جیسے خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شعلوں سے پھولوں کا چننا اچھا لگتا ہے۔ علامہ کے افکار میں عشق ایک خاص مقام رکھتا ہے جو عقل سے افضل ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مردِ خدا کا عمل عشق کی وجہ سے ممتاز ہوتا ہے اور علامہ کے نزدیک عشق وہ جذبہ ہے جو اصلی زندگی کی نشان دہی کرتا ہے اور جس کے لیے فنا نہیں۔

۳۹۔ ممکنات قوت مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جو لوگ ''مردانِ کار'' اور میدانِ عمل کے شہسوار ہیں، مشکل پسندی کو اختیار کرتے ہیں۔ اسی سے مردانِ کار کی اصلی قوت و طاقت سامنے آتی ہے۔

۴۰۔ حرب دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را این یک آئین است و بس

جو لوگ پست ہمت والے ہیں ان کا حربہ اور طریقہ بس صرف دشمنی اور عداوت ہے۔ ان کے نزدیک بس جینے کا یہی ایک قانون و دستور ہے۔ وہ اپنی فطرت کی پستی اور کم ہمتی کے سبب یہ کام انجام دیتے ہیں۔

۱۴۔ زندگانی قوت پیداستے

اصل او از ذوق استیلاستے

یہ زندگانی، تو ایک قوت و طاقت کا نام ہے۔ اس کی اصل، جڑ اور حقیقت کسی شے پر غالب آجانے کا ذوق ہے۔

علامہ اقبال فلسفۂ زندگی کو نہایت خوبصورت انداز اور مختصر الفاظ میں بیان کر رہے ہیں۔ زندگانی کی حقیقت، اس کی اصلیت و ماہیت ظاہر ہے واضح ہے، پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔ زندگانی ایک ایسی قوت کو کہتے ہیں جو ہر شے پر غالب آجانے کا ذوق اور شوق رکھتی ہو۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب فلسفۂ زندگی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

☆☆☆☆☆

۴۲۔ عفو بیجا سردیِ خونِ حیات

سکتۂ در بیت موزونِ حیات

عفو و درگزر اگرچہ ایک مستحسن عمل ہے۔ یہ خدائی صفت ہے اور "تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" کے مصداق اسے ہر فرد کو اپنانا چاہیے لیکن کسی کو بلاوجہ معاف کر دینا جبکہ وہ معاف کرنے کا مقام اور معاف کرنے کی جگہ نہ ہو تو اس کا سبب یہی ہے کہ معاف کرنے والے کا خون جوش سے عاری ہو کر سرد پڑ چکا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے زندگی کے موزوں گھر میں سکتہ سا آگیا ہو یعنی جمود طاری ہو گیا ہو۔

۴۳۔ ہر کہ در قعر مذلّت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است

جو شخص ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گر گیا ہے اس نے بے طاقتی اور کمزوری کا نام قناعت رکھ لیا ہے۔

قناعت بہترین صفت اور زبردست خوبی کا نام ہے۔ قانع اللہ کا محبوب بندہ ہوتا ہے لیکن مشکلات سے ہار کر سپر انداز ہو جانے کو قناعت نہیں کہا جا سکتا۔ کوشش و کاوش اور سعی پیہم کے بعد قناعت کی منزل آتی ہے، کمزوری کا نام قناعت نہیں ہے، بے طاقتی کو قناعت نہیں کہا جاتا۔ اللہ تبارک نے انسان کو دنیا میں دیگر مخلوقات پر شرف اور فضیلت عطا کی ہے۔ اسے عقل و خرد کی نعمت اور دولت سے مالا مال کیا ہے۔ اسے یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ اپنی قوت و طاقت کے بل بوتے پر ہمالیہ کی چوٹی کو بھی فتح کر سکتا ہے اور شاہینوں کی طرح بلند پروازی کو بھی اپنا شعار بنا سکتا ہے۔ اب اگر یہ انسان باوجود ان تمام انعامات و اکرامات کے قعر مذلت میں گر جاتا ہے، گم نامی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے اور کمزوری اور ناطاقتی کو اپنا لیتا ہے اور اپنا حق حاصل کر لینے کی بجائے اس کا نام قناعت رکھ دیتا ہے تو ایسے شخص کا کوئی علاج نہیں اور معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: اَلْقَنَاعَةُ كَنْزٌ لَا يَنْفَدُ۔ قناعت ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

۴۴۔ ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

ناتوانی، کمزوری اور بے طاقتی زندگی کے لیے رہزن ہے اور خوف اور جھوٹ اس کے شکم میں پرورش پا رہا ہے۔

یہاں جسمانی کمزوری مراد نہیں ہے بلکہ ایمان و عمل کی کمزوری مراد ہے۔ یعنی وہ اپنی ناتوانی کے خوف کو خود سے جھوٹ بول کر چھپا رہا ہے وہ حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود حق بات کو معاشرے سے اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے ناتوانی کے عذر سے حق کہنے کے

بجائے جھوٹ افشا کیے ہوئے ہے۔ خوف اور جھوٹ دونوں انسان کو ناتواں اور کمزور بنا دیتے ہیں اور اس کی قوت و طاقت کو سلب کر لیتے ہیں اور اس طرح یہ جیتا جاگتا انسان مردوں کی صف میں چلا جاتا ہے اور اسی کی بستی میں جا بستا ہے۔

۳۵۔ از مکارم اندرون او تہی است
شیرش از بہر رم فربہی است

اس کا باطن مکارم اخلاق سے خالی ہے اور اس کا دودھ برائیوں اور قابل مذمت باتوں کے لیے موٹاپے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ایسا شخص وہ ہے جس کا باطن اخلاقی خوبیوں، اچھائیوں اور نیکیوں سے خالی ہے۔ جسم بظاہر پھولتا جا رہا ہے، تن و توش میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس کا باطن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اسے چاہیے کہ خود کو مکارم اخلاق سے آراستہ کرے۔

۳۶۔ ہوشیار اے صاحب عقل سلیم
در کمینہا می نشیند ایں غنیم

علامہ اقبال نصیحت کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ اے عقل سلیم کے مالک! تجھے چاہیے کہ ایسے دشمن سے ہوشیار اور باخبر ہو جا جو ذہن کی کمیں گاہ میں چھپ کر بیٹھا ہے۔ وہی تین چیزیں جن کا انھوں نے پہلے تذکرہ کیا تھا۔ ناتوانی، خوف اور جھوٹ اسے رہزن اور دشمن قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ دشمن ہم پر وار کرنے کے لیے چھپ کر بیٹھتا ہے۔ دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کے حملے جاری و ساری ہیں۔

۳۷۔ گر خردمندی فریب او مخور
مثل حربا ہر زماں رنگش دگر

اے شخص! اگر تو عقل و خرد کا مالک ہے اور اپنی عقل و دانش سے کام لیتا ہے تو ہرگز اس کا فریب نہ کھانا۔ چونکہ ایسا شخص ہر زمانے میں زمانے کے مطابق روپ دھار لیتا ہے۔ تم جب اسے دیکھو گے تو وہ تمھیں گرگٹ کی طرح ہر وقت نئے رنگ و آہنگ میں دکھائی دے گا۔ لہٰذا

ایسا فرد قابل بھروسا اور لائق اعتماد و اعتبار نہیں ہے۔

۴۸۔ شکل او اہل نظر نشنا ختند
پردہ ہا بر روئے او انداختند

یہاں ہم پہلے مصرعے میں لفظ 'اہل نظر' پر گفتگو کرتے ہیں اہل نظر علم میں دانا و بینا شخص کے لیے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ صاحبان نظر بھی ایسے شخص کو پہچان نہ سکے وہ دھوکا کھا گئے اس لیے کہ فریبی لوگ نہ جانے اپنے چہروں پر کتنے چہرے سجالیتے ہیں۔ ظاہر کچھ ہوتا ہے باطن کچھ، ان کا اصلی چہرہ نظر نہیں آتا اور اس طرح وہ لوگوں کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں عام آدمی کیا صاحبان فکر و نظر بھی ایسے چہروں کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کو نفاق بھی کہتے ہیں۔

گاہ او را رسم وزہی پردہ دار
گاہ می پوشد ردائے انکسار

اس شعر میں بھی علامہ اقبال نے سابقہ شعر کے مضمون کو اور واضح کیا ہے کہ وہ شخص کبھی تو آپ کے ساتھ نہایت مہربانی کے ساتھ پیش آئے گا۔ اور کبھی وہ انکساری و خاکساری کی چادر اوڑھ کر ہمارے سامنے آتا ہے اور لوگ اس کی انکساری کو دیکھ کر اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

۵۰۔ گاہ او مستور در مجبوری است
گاہ پنہاں در تہِ معذوری است

کبھی تو وہ مجبوری و لاچاری کے پردوں میں خود کو چھپا لیتا ہے اور کبھی وہ معذوری کی تہوں میں چھپ جاتا ہے۔ وہ دراصل لوگوں کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ یہی وہ پردے ہیں جن کی بابت علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

"پردہ ہا بر روئے او انداختند"

☆☆☆

۵۱۔ چہرہ در شکل تن آسانی نمود
دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود

منافق نے تن آسانی میں اپنا چہرہ دکھا کر صاحب قوت کے ہاتھ سے اس کے دل کو اُچک لیا ہے۔

علامہ اقبال نے زندگی کا فلسفہ اس شعر میں تفصیل سے نظم کیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی جدوجہد اور عمل پیہم سے عبارت ہے۔ وہ جمود کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ تن آسانی یا تن بہ تقدیر کا فلسفہ ان کے نزدیک باطل ہے۔ تن آسانی انسان کو کاہل و آرام طلب بناتی ہے، عمل اور کارکردگی سے روک دیتی ہے جو قوت وطاقت کے مالک ہیں وہ اس کی باتوں میں آکر اپنا دل ہار دیتے ہیں۔ اس شعر میں علامہ اقبال تن آسانی کا لفظ لائے ہیں جس کا مطلب آرام طلبی ہے گزشتہ شعروں کو سامنے رکھتے ہوئے کہنا پڑے گا کہ جو تن آسانی اس کے چہرے پر نمایاں ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے خون میں حرارت اور ہمت کا فقدان ہے جس سے وہ کاہل اور آرام طلب ہو گیا، وہ کسی جدوجہد میں پڑ کر اپنے راحت و آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا اسے صرف اپنی فکر ہے اُس کے گرد وپیش کیا ہو رہا ہے اس سے اُس کو کوئی سروکار نہیں۔

۵۲۔ با توانائی صداقت توأم است
گر خود آگاہی ہمیں جام جم است

توانائی اور تخلیب طاقت و قوت، جرأت و ہمت کے ساتھ صداقت اور سچائی توأم (جڑواں) ہے۔ اگر تم خود آگاہی رکھتے ہو اور خود کو پہچانتے ہو تو سمجھ لو کہ یہی جام جمشید ہے۔ جمشید ایران کا بادشاہ تھا۔ جس کے پاس ایک ایسا بڑا پیالہ تھا جس میں پوری کائنات نظر آتی تھی اور وہ پورے جہان کی خبر رکھتا تھا اسی جام جمشید کو جام جہاں نما بھی کہا جاتا ہے اسے شعراء آئینہ تحریر کرتے ہیں۔

اور اسی لیے ارشاد فرمایا گیا:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

جس نے خود کو پہچان لیا گویا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور یہی بات علامہ اقبال اپنے شعروں میں جا بجا کہتے نظر آتے ہیں۔

غالب نے جام جم کا تذکرہ اس طرح کیا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

۵۳۔ زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرح رمز حق و باطل قوت است

زندگی کھیتی کی طرح اور اس کھیتی سے جو کچھ ملتا ہے اناج وغیرہ وہ سب کا سب قوت و طاقت ہے اور حق و باطل کے رمز و رموز کی تشریح کا نام قوت ہے۔

علامہ اقبال اس شعر میں زندگی اور حیات کو کھیتی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ کسان جس طرح زمین میں ہل چلاتا ہے، بیج بوتا ہے، وقت پر سینچائی کرتا ہے، اناج کے اُگنے تک اسے ہر آفت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کونپل نظر آتی ہے اور وہ تنا اور خوشہ نکالتی ہے تو اسے اُمید کی کرن نظر آتی ہے۔ جب سبزہ لہلہاتا ہے، بالیاں جھومتی ہیں تو اس کی آرزوئیں اور تمنائیں بار آور ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ علامہ اقبال اس کا نام قوت رکھتے ہیں کہ یہ قوت ہی ہے جس کا یہ کرشمہ ہے اور قوت ہی ہے جس کا یہ ثمرہ ہے۔ یہ قوت ہی ہے جس کا یہ نتیجہ ہے۔ پھر دوسرے مصرع میں حق و باطل کے رمز کی تشریح قوت سے کرتے ہیں۔ غالباً اسی بات کو علامہ اقبال نے "در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا" میں ان اشعار کے ذریعے واضح کیا:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات، آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

☆☆☆

۵۴۔ مدعی گر مایہ دار از قوت است

دعوے او بے نیاز از حجت است

اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ قوت وطاقت کا سرمایہ رکھتا ہے تو اسے اپنے دعوے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس کی طاقت وقوت خود دلیل بن جائے گی۔ اسے کسی اور دلیل، ثبوت اور برہان کی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ علامہ اقبال کا فلسفہ ہے۔ ان کے نزدیک جینے کا حق اسی کو حاصل ہے جس کے ہاں قوت وطاقت ہے۔ اگر کوئی ناتوانی رکھتا ہے تو پھر یہ ناتوانی اس کے لیے موت کا پیش خیمہ ہے۔ توانائی ہی زندگی میں حرارت اور شعلہ پیدا کرتی ہے اور ایسے ہی فرد کو جینے کا حق ہے جو طاقت وقوت کو اپناتا ہے اور اپنے بل بوتے پر ترقی کے مدارج اور منازل طے کرتا ہے۔

۵۵۔ باطل از قوت پذیرد شانِ حق

خویش را حق داند از بطلانِ حق

علامہ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ باطل نے طاقت وقوت کے بل پر حق کی شان و شوکت کو اپنا لیا ہے اور وہ ایسا قوی بن گیا ہے کہ وہ حق کو جھٹلا کر خود کو حق سمجھنے لگا ہے۔

حق و باطل کا معرکہ ازل سے جاری وساری ہے۔ آدم وابلیس، ابراہیم ونمرود، موسیٰ و فرعون، نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوجہل، حسین اور یزید سب ایک دوسرے کے مقابل میں حق وباطل کے نمائندے کی حیثیت سے نظر آتے ہیں اور علامہ کے اس شعر کے مصداق ہیں۔

علامہ اقبال اپنے اس شعر میں فرمانا چاہتے ہیں کہ باطل جب قوت حاصل کر لیتا ہے۔ اور لوگ طاقت کو ہی حق تصور کر کے اس کا اتباع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ

مِنْ قَبْلُ ۗ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝ (سورۂ ابراہیم ۱۴: ۲۲)

فیصلہ ہو جانے کے بعد شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا جسے میں نے پورا نہیں کیا اور میرا تم پر کوئی زور تو نہیں تھا، بس یہ ہوا کہ میں نے تمھیں دعوت دی تم نے وہ قبول کرلی۔ اب دیکھو مجھے ملامت نہ کرو، خود اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہراؤ۔ یہاں نہ میں تمھاری فریادرسی کرسکتا ہوں اور نہ تم میری۔ تم نے تو مجھے اللہ کا شریک قرار دیا تھا۔ میں تو پہلے ہی اس بات سے بیزار ہوں۔ ظالموں کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔

۵۶۔ از کُن او زہر کوثر می شود
خیر را گوید شرے شر می شود

اس کی "کُن" (ہو جا) سے زہر بھی کوثر ہو جاتا ہے۔ وہ اگر خیر کو شر کہتا ہے تو خیر شر بن جاتا ہے۔ یعنی جس کے ہاتھ میں قوت و طاقت اور اقتدار و اختیار ہوتا ہے پھر ہر شے پر اسی کا حکم چلتا ہے اور اسی کا سکہ رائج ہو جاتا ہے اور وہی معتبر قرار پاتا ہے۔

علامہ اقبال پہلے مصرع میں لفظ "کُن" لائے ہیں اور اس سے اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۝ (سورۂ یٰس ۳۶: ۸۲)

بس اللہ کا امر یہی ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ "کُن" کہتا ہے اور وہ شے وجود میں آجاتی ہے۔

۵۷۔ اے ز آدابِ امانت بے خبر!
از دو عالم خویش را بہتر شمر!

اے انسان! اے امانت خداوندی کے حامل تو امانت داری کے ادب و آداب سے بے خبر کیوں ہے تو اپنی حقیقت کو پہچان اور اپنے آپ کو دونوں جہاں میں بہتر اور برتر شمار کر۔

اے غافل انسان! تیرے ذمے امانت الٰہی کا بوجھ ہے تجھ میں روح الٰہی پھونکی گئی ہے جس کا تو امین ہے۔ اپنے آپ کو ایک معمولی جرثومہ نہ سمجھ۔ تو خود کو حقیر، فقیر اور پُر از تقصیر خیال نہ کر۔ تجھے ایسی امانت سپرد کی گئی ہے اور وہ عظیم امانت تیرے حوالے کی گئی ہے جس کی وجہ سے

تو تمام عالم اور پوری کائنات سے افضل اور بہتر قرار پایا ہے۔ تجھے ہی اس امانت کا اہل گردانا گیا ہے آسمان، زمین اور پہاڑ کے انکار کے بعد تو نے اس امانت کو سنبھالنے کا عہد کیا ہے لہٰذا تو معمولی انسان نہیں بلکہ امانت کو اٹھانے کی وجہ سے تو خود کو دونوں جہاں سے بہتر، برتر، اعلیٰ اور ارفع شمار کر۔ علامہ اقبال درحقیقت اس شعر میں اس آیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَ أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (سورۃ الاحزاب ۳۳: ۷۲)

بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو ان سب نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس بات سے ڈر گئے۔ انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلوم و جہول تھا۔

دنیا و آخرت میں انسان سے بہتر کوئی اور نہیں ہے۔ لقد کرمنا بنی آدم کا تاج تیرے ہی سر پر رکھا گیا اور فَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا (ہم نے اپنی اکثر مخلوقات پر صرف انہیں فضیلت عطا کی ہے) تیرے ہی لیے کہا گیا ہے۔

آیت کے مضمون کو حافظ شیرازی نے کیا خوب بیان کیا ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

آسمان امانت کا بوجھ اٹھانے کی توانائی نہ رکھتا تھا لہٰذا جب فال نکالی گئی تو قرعۂ فال میرے نام نکلا یعنی اولاد آدم کا انتخاب ہوا۔

۵۸۔ از رموز زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل زغیر اللہ شو

اے انسان! تو زندگی کے رموز سربستہ سے باخبر ہو جا اور غیر خدا سے بے درد اور لاعلم بن جا۔

یہ شعر پہلے شعر سے متصل ہے اور آیت قرآنی کی تفسیر ہے۔ آسمان نے باوجود رفعت

کے اور زمین نے باوجود وسعت کے اور پہاڑ نے باوجود صلابت کے امانت الٰہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انسان آگے بڑھا اور اس امانت خداوندی کو قبول کر لیا۔ ارشاد باری ہوا: انہ کان ظلوماً جہولا۔ یہ تو ظالم و جاہل ہے۔

اسی بات کو علامہ اقبال فرما رہے ہیں کہ زندگی کے راز سے آشنا ہو جا اور غیر اللہ سے بے دردی اور لاعلمی سے پیش آ۔ یعنی غیر خدا کے سامنے سر نہ جھکا۔ اس پر تیرا حکم چلنا چاہیے۔ تجھے اس کا محکوم نہیں ہونا چاہیے تجھ پر لازم ہے کہ غیر اللہ کی ہر بات کو نظر انداز کر کے صرف اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔

۵۹۔ چشم و گوش و لب کشا اے ہوش مند
گر نہ بینی راہ حق بر من بخند

اے صاحب ہوش! تجھے چاہیے کہ اپنی باطنی آنکھ، اپنے باطنی کان اور اپنے باطنی لب کو وا رکھ اُن سے کام لے کر حق کا راستہ تلاش کر۔ حق کی بات سن اور حق کی بات کر اور اگر پھر بھی تجھے نور حق نظر نہ آئے تو شوق سے میرا مذاق اڑا لینا۔ میں نے تجھے راہ حق تک پہنچنے کا راز بتلا دیا ہے اور راز سے آشنا کر دیا ہے۔

یاد رہے کہ اقبال کا یہ شعر مولانا روم کے درج ذیل شعر کی تضمین ہے۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی نور حق بر من بخند

علامہ اقبال نے مولانا رومؒ سے ہی اس فکر کو اخذ کیا ہے البتہ دونوں کا اسلوب جدا جدا ہے۔ یعنی مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ تم اپنی آنکھیں بند کر لو تا کہ وہ کچھ نہ دیکھیں، اپنے کان بند کر لو تا کہ ان سے کچھ سنائی نہ دے اور اپنے لب بند کر لو تا کہ تم اپنی زبان سے کوئی بات نہ کہو۔ اس طرح تم نور حق کو دیکھ لو گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری ہنسی نہ اڑانا کہ میں نے غلط بات کہی تھی۔ مولانا رومؒ ظاہری اعضاء کو بند کرنے کا حکم دے رہے ہیں اس لیے کہ اُن کے نزدیک ظاہر سے باطن کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا اور علامہ اقبال یہ فرماتے ہیں کہ اے ہوش مند اور صاحب

عقل سلیم! تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو، اپنے کان وا رکھو اور اپنے لب کھول دو تا کہ تمھیں راہِ حق نظر آجائے اس لیے کہ راہِ حق تک پہنچنے کے یہی وسائل اور ذرائع ہیں۔

اقبال کے یہاں کھولنے سے مراد باطنی دروازوں کو کھولنا ہے اور حقیقت کا منکشف ہونا ہے۔ مولانا رومؔ کے یہاں ظاہری قوتوں کو بند کرتے ہی باطنی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں اور اسرار و رموز منکشف ہونے لگتے ہیں اور انسان رموز کائنات اور اسرار جہاں سے آشنا ہوجاتا ہے۔ درحقیقت دونوں شعراء نے عالم انسانیت کو چیلنج کیا ہے کہ اس طریقے سے ہر فرد معرفت کی منزلوں کو طے کرسکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم ''در شرح اسرار اسمائے علی مرتضیٰ'' کے ابتدائی بیس شعروں میں ان کی تعریف، توصیف، خوبیوں اور اچھائیوں کو بیان کرنے کے بعد مختلف مضامین بیان کیے ہیں اور ان کی وضاحت کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام ان صفات کے حامل و مالک اس لیے ہوئے تھے کہ انھوں نے تراب کا اپنا زیرنگیں بنالیا تھا اور وہ ابوتراب بن گئے۔ اصل کامیابی یہی ہے کہ انسان اپنے کالبد خاکی کو اپنے قابو میں کرلے اور اسی مٹی سے آدمیت اور انسانیت کی عمارت تعمیر کرے۔ پھر وہ ناکامی پر آنسو بہانے اور نالہ و شیون سے روک کر سعی و عمل اور جد و جہد کی تلقین کر رہے ہیں۔ وہ زمانے سے مقابلہ کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ وہ قوت کے ذریعے روزگارِ نو کی تعمیر کے خواہاں ہیں۔ وہ فلسفۂ عشق کو بیان کرتے ہوئے خلیل اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ عفوِ بے جا کے قائل نہیں۔ وہ ناتوانی کو موت سمجھتے ہیں۔ وہ مکارم اخلاق کے فضائل اور رذائم کے رذائل سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ غیر اللہ سے رشتہ توڑنے اور اللہ سے رشتہ جوڑنے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ امانت کا ذکر کرتے ہیں جس سے اللہ نے انسان کو نوازا ہے اور پھر وہ راہِ حق دیکھنے کا طریقہ سمجھاتے ہیں اور ذکر علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ ان فضائل کو بیان کرنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ان تمام صفات کے مظہر تھے اور اسی لیے ایسا اعلیٰ اور ارفع مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

☆☆☆

در معنیِ حُریتِ اسلامیہ و سرِ حادثۂ کربلا

ہر کہ پیماں با ھُوالموجود بست
گردنش از بندِ ہر معبود رست
مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکنِ ما ممکن است
عقل سفاک است و او سفاک تر
پاک تر چالاک تر بے باک تر
عقل در پیچاکِ اسباب و علل
عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است
آں کند تعمیر تا ویراں کند
ایں کند ویراں کہ آباداں کند
عقل چوں باد است ارزاں در جہاں
عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساسِ چون و چند
عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل میگوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحانِ خویش کن

عقل با غیر آشنا از اکتساب
عشق از فضل است و با خود در حساب
عقل گوید شاد شو آباد شو
عشق گوید بندہ شو آزاد شو
عشق را آرام جاں حریت است
ناقہ اش را سارباں حریت است
آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد
عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد
آں امام عاشقاں پور بتول
سرو آزادے ز بستان رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل
دوش ختم المرسلیں نعم الجمل
سرخ رو عشق غیور از خون او
شوخی ایں مصرع از مضمون او
درمیان امت آں کیواں جناب
ہمچو حرف قُلْ هُوَ اللّٰه در کتاب
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت

حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم

چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

بر زمینِ کربلا بارید و رفت

لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

تا قیامت قطعِ استبداد کرد

موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است

پس بنائے لا الہ گردیدہ است

مدعایش سلطنت بودے اگر

خود نکردے با چنیں ساماں سفر

دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتعد

دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

سرِ ابراہیم و اسمٰعیل بود

یعنی آں اجمال را تفصیل بود

عزمِ او چوں کوہساراں استوار

پایدار و تند سیر و کامگار

تیغ بہر عزتِ دین است و بس

مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست

پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

خونِ او تفسیر ایں اسرار کرد
ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید
از رگِ اربابِ باطل خوں کشید

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

رمزِ قرآں از حسین آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں
اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

رموزِ بے خودی ص ۱۲۵۔۱۲۸ نظم کا عنوان ہے

در معنیِ حُریتِ اسلامیہ و سرِّ حادثۂ کربلا

اس مفہوم میں کہ اسلامی آزادی کیا ہے؟ اور واقعۂ کربلا کا راز۔
اس نظم میں کل 39 اشعار ہیں۔

۱۔ ہر کہ پیماں با ھو الموجود بست
گردنش از بندِ ہر معبود رست

جس نے بھی "ھو الموجود" یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ سے عہد و پیماں کر لیا تو سمجھ لو کہ اس کی

گردن ہر معبود سے آزاد ہوگئی۔ علامہ اقبال اس شعر میں وحدانیت کا راز منکشف کر رہے ہیں کہ اگر انسان صحیح معنی میں لا الہ الا اللہ کہہ کر وحدانیت کا اقرار کرلے تو درحقیقت یہ ایک عہد و پیماں ہے جو وہ اللہ سے کر رہا ہے۔ لا الہ کہہ کر وہ ہر معبود کا انکار کر رہا ہے اور اس انکار کے بعد وہ ایک اللہ وحدہ لاشریک لہ کا اقرار کر رہا ہے۔ اور اب اسے کسی اور معبود کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ممکن است

مومن کا تعلق عشق سے ہے اور عشق مومن سے وابستگی رکھتا ہے۔ ہمارے نزدیک جو چیزیں ناممکن نظر آتی ہیں عشق انہیں ممکن بنا دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں عشق اور عقل کا تقابل کیا ہے۔ ان کے نزدیک عشق افضل ہے اور عقل مفضول۔ عشق انسان کو صاحب ایمان بناتا ہے اور عقل اسے ایمان سے دور کرتی ہے۔ عشق یقین کا نام ہے اور عقل وہم کو جنم دیتی ہے۔

۳۔ عقل سفاک است و او سفاک تر
پاک تر چالاک تر بے باک تر

علامہ اقبال اس شعر میں بھی عشق اور عقل کا مقابلہ کرتے ہیں اور دونوں کی صفات بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ عقل سفاک ہے یعنی بہت خوں ریزی کرتی ہے، خون بہاتی ہے، قتل و غارت گری کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے میدان کارزار گرم ہوتا ہے، تن و سر میں جدائی ہوتی ہے اور عشق اس سے بھی زیادہ سفاک ہے۔ پھر اس کی تین صفتیں بیان کی ہیں کہ عشق پاک تر جذبہ ہے۔ عشق زیرک و ہوشیار بھی ہے اور عشق میں جھجک نہیں ہوتی بلکہ وہ بہت بے باک ہوتا ہے۔

۴۔ عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگاں باز میدان عمل

عقل اسباب و علل کی گتھیوں میں اُلجھی رہتی ہے جب کہ عشق میدانِ عمل میں چوگاں باز (یعنی پولو کے کھیل کا ماہر) ہے۔ عقل ہر عمل کے اسباب اور علتوں کو تلاش کرنے میں اپنا وقت صرف کر دیتی ہے۔ عشق آگے بڑھ کر میدانِ عمل تک پہنچ جاتا ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

☆☆☆

۵۔ عشق صید از زورِ بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند

عشق اپنی طاقت و قوت اور زورِ بازو کے بل بوتے پر شکار کرتا ہے اور اس کے مقابل میں عقل مکار ہے۔ وہ صرف جال ڈالتی رہ جاتی ہے۔ علامہ اقبال اس شعر میں عشق و عقل کا تقابل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عقل مکاری سے کام لیتی ہے۔ وہ پرندے کو دھوکا دینے کے لیے جال بچھاتی ہے، دانے ڈالتی ہے اور فریب کے ذریعے اسے پھنسانا اور گرفتار کرنا چاہتی ہے جبکہ عشق کو اپنی طاقت اور زورِ بازو پر بھروسا ہے اور براہِ راست اپنے شکار پر جھپٹتا، لپکتا اور اسے دبوچ لیتا ہے اور زمین پر گرا دیتا ہے۔ عقل عیار ہے طرح طرح کے بھیس بدل لیتی ہے اور مختلف صورتوں میں دکھائی دیتی ہے۔

۶۔ عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است

عقل کا تمام تر سرمایہ خوف اور شک پر مبنی ہے اور عشق کو پونجی عزم بالجزم اور یقینِ کامل ہے جو لاینفک (جدا نہ ہونے والا) ہے۔

اس شعر میں بھی عقل اور عشق کا موازنہ کیا گیا ہے کہ عقل کا کام دلوں میں خوف پیدا کرنا اور انسان کو شک و شبہے میں مبتلا کرنا ہے۔ اس کے برعکس عشق جو عمل کرتا ہے اُس میں اُس کا عزم بالجزم ہوتا ہے۔ خوف اور شک نہیں۔ خوف کے مقابلے میں عزم اور شک کے سامنے یقین

کامیاب وکامران ہوتا ہے۔

۷۔ آن کند تعمیر تا ویراں کند
این کند ویراں کہ آباداں کند

عقل کسی شے کی تعمیر اس لیے کرتی ہے کہ وہ اسے ویران اور غیر آباد کردے اور عشق کسی کی ویرانی کا سامان فراہم کرتا ہے تاکہ اسے آباد کردے۔ اس شعر میں بھی علامہ اقبال عقل اور عشق کا موازنہ کررہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ عقل کی تعمیر میں تخریب پنہاں ہے اس لیے کہ عقل کسی کام سے مطمئن نہیں ہوتی اور یہی شک اسے مزید بہتر کرنے کے چکر میں پھنسا دیتا ہے اور اس طرح تعمیر تخریب میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ بنا بنایا گھر اجڑ جاتا ہے۔ آبادی بربادی میں بدل جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں عشق کا شاخسانہ اور عشق کا کارنامہ بھی ویران کردیتا ہے اور بسے بسائے کو اجاڑ دیتا ہے لیکن یہ تخریب تعمیر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ یہ ویراں ہی اس لیے ہوتا ہے کہ دوبارہ آباد ہو۔

۸۔ عقل چوں باد است ارزاں در جہاں
عشق کمیاب و بہائے او گراں

عقل ہوا کی مانند ہے اور دنیا میں نہایت سستے داموں اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہوا عام ہے اور ہر ایک کو میسر ہے اسی طرح عقل سے بھی انسان کو نوازا گیا ہے۔ وہ جو مہنگی نہیں ہے بلکہ نہایت سستی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے انسانوں میں موہبت کیا ہے اور ہر شخص کو عقل ارزانی کی گئی ہے اور وہ عقل کی بنیاد پر جانوروں اور دیگر مخلوقات پر شرف اور فضیلت رکھتا ہے مگر اس کے مقابل میں عشق نہایت کمیاب ہے، اس کا ملنا دشوار ہے، ہر ایک کو نہیں ملتا اور وہ بیش قیمت ہے، سستے داموں میسر نہیں آتا، اس کے حصول کے لیے بڑی جدوجہد اور کوشش وکاوش درکار ہوتی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ہر انسان عقل کی دولت سے مالا مال ہے لیکن عشق کی نعمت اور عشق کا سرمایہ ہر ایک کو میسر نہیں ہے۔ عقل ارزاں ہے اور عشق گراں۔ عقل عام ہے اور عشق خاص۔ عقل سہل الحصول ہے اور عشق

کمیاب اور نایاب ہے۔

۹۔ عقل محکم از اساس چون و چند
عشق عریاں از لباس چون و چند

عقل سوال و جواب کی بنیاد سے محکم ہوتی ہے اور عشق "چون و چند" کے لباس سے عریاں یعنی آزاد ہے۔ عقل کا استحکام اور اس کی اساس "کیوں اور کیسے" پر ہے۔ وہ ہر چیز کے بارے میں تحقیق اور جستجو کرنا چاہتی ہے اور وہ سوال و جواب کے ذریعے دائرۂ تحقیق و جستجو کو آگے بڑھاتی ہے اور یہی سوال و جواب اس کی توانائی اور استحکام ہے اور عشق چوں و چرا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ عشق کے چہرے پر کوئی پردہ پڑا ہوا نہیں ہے۔ اس نے چوں و چند کا لباس نہیں پہن رکھا ہے۔

۱۰۔ عقل میگوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن

عقل، عشق کو للکار رہی ہے کہ میرے سامنے میرے مقابلے پر آ، عشق عقل سے کہتا ہے کہ تو پہلے اپنا امتحان کر لے کہ کیا تجھ میں میرے مقابلے کی ہمت ہے۔ گویا کہ دونوں عقل اور عشق ایک دوسرے سے مبارز طلب ہیں۔

۱۱۔ عقل باغیر آشنا از اکتساب
عشق از فضل است و با خود در حساب

عقل اکتساب (کسب فیض) کی بنیاد پر غیر اللہ سے آشنا ہوتی ہے اور اس کے مقابل میں عشق اسی کو ملتا ہے جس پر فضل و کرم ہو اور عشق خود اپنی جانچ پڑتال کرتا ہے۔

۱۲۔ عقل گوید شاد شو آباد شو
عشق گوید بندہ شو آزاد شو

عقل کہتی ہے تم خوش رہو اور آباد رہو، اس کے مقابل میں عشق کا یہ کہنا ہے تم عبد خدا بن جاؤ تاکہ دنیا و مافیہا سے آزاد ہو جاؤ۔

عقل کا خیال ہے کہ شاد اور آباد رہنا ہی زندگی اور اصل مقصدِ حیات ہے لیکن اس کے برعکس عشق یہ کہتا ہے کہ جب کوئی عشقِ الٰہی سے سرشار ہو کر اس کی غلامی اختیار کر لیتا ہے تو یہ بندگی شرمندگی نہیں بلکہ تابندگی ہوتی ہے۔

۱۳۔ عشق را آرامِ جاں حریت است
ناقہ اش را ساربان حریت است

عشق کے لیے دل کا سکون اور چین آزادی ہے اور اس کے ناقے کا ساربان بھی آزادی ہے۔ عشق اور عقل کا موازنہ کرنے کے بعد اس شعر میں صرف عشق کا ذکر کیا گیا ہے جو آزاد طبع ہے اور غلامی سے نفور ہے۔ عشق حریت کا متوالا اور آزادی کا گرویدہ ہے اسے غلامی سے نفرت اور بندگی سے عداوت ہے۔

۱۴۔ آن شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد
عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد

کیا تم نے یہ سنا ہے کہ جنگ کے موقع پر عشق نے اس عقل کے ساتھ جو ہوس کی پروردہ تھی، کیسا سلوک کیا ہے؟ علامہ اقبال تمہیدی اشعار کے بعد اب اپنا رُخ واقعۂ کربلا کی طرف موڑتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ حسین علیہ السلام و یزید کی جنگ دراصل عشق اور عقل کی جنگ تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ عقلِ ہوس پرور کا عشق سے مقابلہ تھا جس میں عشق نے ہوس کو شکست دی، عقل رسوا ہوئی اور عشق سرخرو اور سرافراز ہوا۔

۱۵۔ آں امامِ عاشقاں پورِ بتول
سروِ آزادی ز بستانِ رسول

وہ حسین علیہ السلام جو عاشقوں کے امام ہیں، وہ زہرا کے دل بند ہیں۔ وہ چمنستانِ رسالت کے سروِ آزاد ہیں۔

اس شعر میں علامہ اقبال نے تین باتیں پیش کی ہیں۔ سب سے پہلے حضرت حسین علیہ السلام کو عاشقوں کا امام کہا ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری ہے۔

یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمۡ ۚ فَمَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیۡنِهٖ فَاُولٰٓئِکَ یَقۡرَءُوۡنَ کِتٰبَهُمۡ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ۝ (سورۂ اسراء ۱۷:۷۱)

جس دن ہم ہر انسان کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے اور حسین علیہ السلام عاشقوں کے امام ہیں تو جتنے عاشقان حسین علیہ السلام ہیں۔ سب قیامت کے روز انہی کے ساتھ محشور ہوں گے۔ دوسری بات جو کہی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت حسین علیہ السلام حضرت "بتول" فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے فرزند اور دل بند ہیں۔

تیسری بات علامہ اقبال نے اس شعر میں یہ کہی ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام چمن رسالت کے سرو آزاد ہیں۔ وہ امام حسینؑ کو سرو آزاد کہہ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ کسی فاجر و فاسق کی بیعت نہیں کر سکتے کیوں کہ جو آزاد ہوتا ہے وہ کسی کا پابند اور مطیع و منقاد نہیں ہوتا۔

۱۶۔ اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

اللہ اللہ یہاں بہ انداز تعجب و حیرت بھی ہے اور بہ انداز تحسین بھی۔ کیا کہنا حضرت امام حسین علیہ السلام کا۔ ذرا ان کے محاسن و فضائل پر نظر کرو۔ ان کی خوبیوں کو دیکھو، ان کی عظمت و جلالت کا مشاہدہ کرو۔ اگر تم ان کے پدر عالی قدر کو دیکھو گے تو وہ بائے بسم اللہ ہیں یعنی بائے بسم اللہ کے نیچے کا نقطہ یعنی انہی سے "با" کی شناخت ہوتی ہے۔ اشارہ ہے اس روایت کی طرف جس میں فرمایا گیا:

رَوَى الشَّيۡخُ الۡجَزَائِرِيُّ فِي الۡاَنۡوَارِ عَنۡ عَلِيٍّ عَلَيۡهِ السَّلَامُ اَنَّهٗ قَالَ عِلۡمُ مَا كَانَ وَمَا يَكُوۡنُ كُلُّهٗ فِي الۡقُرۡاٰنِ وَعِلۡمُ الۡقُرۡاٰنِ كُلُّهٗ فِي سُوۡرَةِ الۡفَاتِحَةِ وَعِلۡمُ الۡفَاتِحَةِ كُلُّهٗ فِي الۡبَسۡمَلَةِ وَعِلۡمُ الۡبَسۡمَلَةِ كُلُّهٗ فِي بَائِهَا وَاَنَا النُّقۡطَةُ تَحۡتَ الۡبَاءِ۔

جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہونے والا ہے ان سب کا علم قرآن میں ہے اور قرآن کا مکمل علم سورۂ فاتحہ میں ہے اور سورۂ فاتحہ کا تمام علم بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ہے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم کا مکمل علم اس کی "با" میں ہے اور میں وہ نقطہ ہوں جو "با" کے نیچے ہے۔

برسی نے مشارق الانوار ص 21 پر یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:
اَنَا النُّقْطَةُ الَّتِیْ تَحْتَ الْبَاءِ۔ میں وہ نقطہ ہوں جو "ب" کے نیچے ہے اور ذبح عظیم کا مفہوم ان کا بیٹا ہے یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ وہی "فَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ" کی تفسیر ہیں۔ قرآن مجید نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

(سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۲)

جب وہ بیٹا ان کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو ابراہیم نے اس سے کہا۔ اے میرے بیٹے! میں خواب میں بار بار دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، بتاؤ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے جواب دیا۔ ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جا چکا ہے آپ اسے بجا لائیے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ (سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۳۔۱۰۷)

پھر جب دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو کروٹ کے بل لٹا دیا۔

اور ہم نے آواز دی۔ اے ابراہیم! بے شک تم نے خواب کو سچ کر دکھایا ہے۔ ہم نیکوکاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی اور ہم نے اس (اسماعیل) کا فدیہ ذبح عظیم کو قرار دیا۔

دوسری جگہ اس واقعے کو علامہ اقبال نے اس طرح ادا فرمایا ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیل

☆☆☆☆☆

۱۷۔ بہر آن شہزادۂ خیر الملل
دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل

بہترین ملت یعنی اُمتِ مسلمہ کے اس شہزادے یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے ختم المرسلین، خاتم النبیین کا دوش سواری بن گیا اور دیکھنے والے نے اس کیفیت کو دیکھ کر کہا: نعم الجمل۔ اونٹ کتنا اچھا ہے۔ اس شعر میں تلمیح ہے۔ مشہور واقعے کی طرف کہ عید کا دن تھا۔ سب بچوں کے پاس سواریاں تھیں۔ دونوں شہزادوں (حضرت حسن علیہ السلام و حضرت حسین علیہ السلام) نے سواری کی فرمائش کی تو سرکارِ دو جہاں ختمی مرتبت بچوں کے لیے اونٹ بن گئے اور بچوں سے کہا کہ میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ اور وہ مدینے کی گلیوں میں چکر لگانے لگے۔

عن ابن الزبیر عن جابر رضی اللہ عنہ قال دَخَلْتُ علی رَسُوْلِ اللّٰہ و الحسن و الحسین علی ظہرہ وھو یمشی علی اربع ویقول نعم الجمل جملکُمَا وَنِعْمَ الْعدلانِ اَنْتُمَا۔

حافظ ابو القاسم عبد الکریم فی التدوین۔ ج 4 ص 22، بحوالہ ملحقات الاحقاق۔

ابن زبیرؓ سے مروی ہے۔ وہ جابرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا میں حضور سرورِ کائنات کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھا کہ حضرت حسن علیہ السلام و حضرت حسین علیہ السلام حضورؐ کی پشت پر سوار ہیں اور وہ دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کے بل چل رہے ہیں اور فرما رہے ہیں تمھارا اونٹ بہترین اونٹ ہے اور تم دونوں کتنے انصاف پسند ہو یا مقابل ہو۔

(علامہ ابن کثیر الدمشقی فی البدایۃ والنہایۃ۔ (ج 8 ص 327))

وقال الترمذی عن ابی الزبیر عن جابر قال دخلت علی رسول اللہ وھو حامِلُ الحسن والحسین علی ظہرہ وھو یمشی بھما علی اربع فقلت نعم الجمل جملکما فقال ونعم العدل علان ھما۔

ترمذی نے کہا۔ ابن زبیر سے مروی ہے۔ وہ جابر سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو کیا دیکھا کہ وہ حضرت

حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کو اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہیں اور اپنے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں زمین پر رکھ کر چل رہے ہیں۔ تو میں نے کہا۔ اے حسن و حسین! تمہارا اونٹ کتنا اچھا ہے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اور یہ دونوں بہترین منصف اور ہم پلہ ہیں۔

عن ابن عباس قال كان رسولُ الله صلى الله عليه وآله وسلم حامل الحسن بن علي على عاتقه فقال رَجُلٌ نعم المركب ركبت يا غلام. فقال النبيّ ونعم الراكب هو. (۳۷۹۳)

ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت امام حسنؑ کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے کسی شخص نے کہا اے لڑکے تم اچھی سواری پر سوار ہو تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اور یہ بہترین سوار ہے۔

۱۸۔ سرخ رو عشق غیور از خونِ او
شوخی این مصرع از مضمونِ او

غیرت مند عشق ان کے خون سے سرخرو ہے اور اس مصرع کی خوبی انھی کے مضمون سے ہے۔

علامہ اقبال اس شعر میں فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے حق و صداقت کے لیے جو اپنا خون بہایا ہے، اپنی جان دی ہے اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے اس کی وجہ سے غیرت مند عشق سرخرو یعنی کامیاب ہوا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خون کی سرخی سے یہ تحریر رقم کی ہے جبھی اس کا رنگ نہایت شوخ و شنگ ہے۔

۱۹۔ درمیانِ اُمت آں کیواں جناب
ہمچو حرفِ قل ھو اللہ در کتاب

اُمت کے درمیان وہ ہستی جو سب سے بلند و بالا ہے یعنی زحل ستارے کی مانند سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے قرآن کریم میں سورہ اخلاص (قل ھو اللہ

احد) کی ہے۔ سورہ اخلاص میں توحید باری عز اسمہ کا ذکر ہے۔ جب لوگوں نے رسول اللہ سے سوال کیا کہ اللہ کا حسب نسب اور خاندان کیا ہے تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔ یہ سورت منزلت اور شان اور عظمت کے اعتبار سے ثلث قرآن کہلاتی ہے۔ اگر اس سورہ کو تین مرتبہ پڑھا جائے تو پورے قرآن کی تلاوت کا ثواب مل جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان وشوکت اور مقام طانؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جس طرح کتاب اللہ میں سورہ قل ھو اللہ احد کو نمایاں مقام حاصل ہے اسی طرح امت محمدیہ میں امام حسینؑ کا مقام ہے۔

۲۰۔ موسیٰ و فرعون شبیرؑ و یزید

این دو قوت از حیات آید پدید

علامہ اقبال نے اس شعر میں حق و باطل کے دو، دو نمائندوں کا ذکر کیا ہے اور تقابل کا انداز اختیار کیا ہے۔ وہ حضرت موسیٰ جو اللہ کے اولو العزم پیغمبر ہیں ان کے مقابل میں فرعون کو رکھا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کیا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ (سورہ طٰہٰ ۲۰: ۲۴)

اے موسیٰ! تم فرعون کی طرف جاؤ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ انھوں نے معجزات باہرہ کے ذریعے فرعون کو شکست دی اور بنی اسرائیل کو فرعون کو ظلم و ستم سے نجات دلائی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ موسیٰ و فرعون کی طرح شبیر و یزید بھی دو قوتیں ہیں جنھیں زندگی نے ظاہر کیا ہے۔ ایک قوت کا نام حق ہے۔ اور دوسری قوت کا نام باطل ہے۔ فرعون اور یزید جس کے نمائندے ہیں۔ علامہ اقبال نے نہایت خوب صورت طریقے سے دو مصرعوں میں حق و باطل کی معرکہ آرائی کو بیان کردیا ہے اور بتایا ہے کہ جو کردار حضرت موسیٰ کا تھا وہی کردار اپنے دور میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا تھا اور جو عمل فرعون کا تھا وہی عمل یزید کا تھا۔ یزید بھی اپنے دور کا فرعون تھا اور امام حسین علیہ السلام بھی اپنے عہد کے موسیٰ تھے جنھوں نے باطل کا قلع قمع کردیا اور حق و صداقت کا پرچم لہرادیا۔ یہی بات علامہ اقبال نے ایک اور جگہ کہی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

☆☆☆

۲۱۔ زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

علامہ اقبال اس شعر میں فرماتے ہیں کہ حق آج حضرت شبیر کی طاقت کی وجہ سے زندہ ہے۔ اور سچ ہے کہ باطل کے لیے حق پر کامیابی حاصل کرنے کی حسرت لیے مرجانا ہی مقدر کر دیا گیا ہے۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ قوتِ شبیری کیا چیز ہے؟ دو مصرعوں میں کوئی تفصیلی بات بیان نہیں کی جاسکتی۔ تاہم ایجاز و اختصار کے ساتھ کام لیتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوتِ شبیری کی پشت پر عشقِ الٰہی کار فرما تھا جس نے حق کو موت کی آغوش میں جانے سے بچا لیا اور یہی تقدیرِ ازلی ہے۔

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

امام عالی مقام نے ایمان کی طاقت، یقین کی قوت اور صداقت کی نصرت و حمایت سے یزید جیسے طاقتور حکمران کو شکست دے کر اسلام کو حیاتِ جاوداں عطا کر دی اور باطل کو موت کی آغوش میں سلا دیا۔

۲۲۔ چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت

علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ جب خلافت نے قرآن کریم اور فرقان حمید سے اپنا رشتہ ناتا توڑ دیا اور حریت کے حلق میں زہر انڈیل دیا۔ یعنی قرآن و سنت کی حکمرانی اور عمل داری کا خاتمہ ہو گیا حق کی آواز کو زہر خورانی اور ظلم و ستم سے دبا دیا گیا۔ یعنی قرآن کریم نے جس خلافت کا ذکر کیا ہے جو منصوص من اللہ ہے ملتِ مسلمہ نے اسے چھوڑ کر دوسرے طریقے اختیار کر لیے اور یہ موروثی بن گئی جو قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ علامہ اقبال اسی امر کی وضاحت

کر رہے تھا۔

۲۳۔ خاست آں سر جلوۂ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

تو ایسے عالم میں حضور خیر الامم کا نمایندہ و بہترین اُمت کا قائد، حضرت امام حسین علیہ السلام کی شکل میں اٹھا، اور اس بادل کی طرح اُفق پر برس گیا جو بارش کی نوید لے کر آ رہا ہو۔ خلافت جب ملوکیت میں تبدیل ہوگئی تو اس نے تمام اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا، اسلام برائے نام رہ گیا، تعلیمات قرآنی کو پس پشت ڈال دیا گیا، سنت نبوی کا مذاق اڑایا گیا۔ اسلام کی صورت مسخ کر دی گئی۔ دین کی شکل کو بگاڑ دیا گیا۔ شجر اسلام سوکھنے لگا۔ اب ضرورت تھی کہ کوئی اٹھے اور اس کی آبیاری کرے۔ اسے سینچ کر پروان چڑھائے اور اس کے برگ و بار کی حفاظت کرے۔ مسلمان تو بہت تھے مگر یزید کی طاقت و قوت کے سامنے کسی میں یہ جرأت نہ تھی جو اسلام کی حمایت و نصرت کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور یزید سے ٹکرلے اور اسلام کے شجر کو دوبارہ تر و تازہ بنائے۔ یعنی نواسۂ رسولؐ نے جب اسلام کی یہ کیفیت دیکھی تو ابرِ باراں بن کر شجر اسلام کو حیات نو عطا کرنے کے لیے میدان عمل میں کود پڑا۔

۲۴۔ برزمین کربلا بارید ورفت
لالہ در ویرانہ ھا کارید ورفت

یہ ابر کرم اٹھا اور کربلا کی زمین پر آ کر برس گیا اور اپنا کام کر کے وہاں سے رخصت ہوا اور ویرانے میں گل ہائے تازہ کھلا کر ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ کی صدا پر لبیک کہتا ہوا چلا گیا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام مسلمانوں کو یزید کی غلامی سے آزاد کرانے اور تعلیمات قرآنی، آئین اسلامی کی حفاظت و حمایت کے لیے سفر کرتے ہوئے سرزمین کربلا پر بادل بن کر برسے اور ویرانے میں ایک چمن کھلا گئے۔ جس کی خوش بو آج بھی پوری کائنات کو معطر اور معنبر بنائے ہوئے ہے۔

۲۵۔ تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

امام حسین علیہ السلام نے جان جان آفرین کے سپرد کر کے قیامت تک جور وستم اور ظلم و استبداد کی شہ رگ کو کاٹ دیا۔ امام حسین علیہ السلام کی یہ قربانی وقتی، آنی اور زمانی نہیں تھی اسی لیے اقبال تا قیامت کا لفظ لائے ہیں بلکہ آپ نے یہ اقدام اس لیے کیا تھا کہ قیامت تک ظلم و جور کی حکمرانی کا قلع قمع ہو اور پھر کسی کی ہمت نہ ہو۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنے خون کی موجوں سے ایسا چمن ایجاد کر دیا ہے جو تا قیام قیامت لہلہاتا رہے گا، جلوہ دکھاتا رہے گا۔

۲۶۔ بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است

امام حسین علیہ السلام حق کی خاطر اور اعلائے کلمۂ حق کے لیے خاک و خون میں غلطاں ہیں اور اس طرح انھوں نے لا الہ کی بنیادوں کو پھر سے محکم اور مستحکم کر دیا ہے۔

دین کا اصل مقصد لا الہ الا اللہ یعنی وحدت خداوندی کا اعلان ہے اور یہی کفر و اسلام میں حد فاصل ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے: أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ بہترین ذکر لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ ہے۔ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ جس نے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ حدیث قدسی میں یہ الفاظ ہیں: كَلِمَةُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ حِصْنِي وَمَنْ قَالَهَا دَخَلَ فِي حِصْنِي۔ ارشاد رب العزت ہو رہا ہے۔ کلمۂ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ میرا مضبوط قلعہ ہے۔ جس نے یہ کلمہ زبان سے جاری کیا تو وہ میرے قلعے میں داخل ہو گیا۔

اسی لیے علامہ اقبال نے امام حسین علیہ السلام کی ذات گرامی کو بنائے ''لا الہ'' قرار دیا ہے۔ اس سے پہلے معین الدین چشتی اجمیریؒ فرما گئے ہیں۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دیں پناہ است حسین

سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

☆☆☆

۲۷۔ مدعایش سلطنت بودی اگر
خود نکردے باچنیں ساماں سفر

اگر امام حسین علیہ السلام کا مدعا حصولِ سلطنت و حکومت ہوتا تو وہ ان حالات میں اور اس انداز سے سفر اختیار نہ کرتے۔

علامہ اقبال اس شعر کے ذریعے ان اعتراضات کو مسترد کر رہے ہیں جو امام حسین علیہ السلام پر کیے جاتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام حصولِ اقتدار کے خواہاں تھے۔ اور ان کا مقصدِ سفر حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت امام حسین علیہ السلام فوج جمع کرتے۔ لشکر اکٹھا کر کے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس کے برعکس چھوٹے اور کمسن بچوں اور مخدراتِ عصمت و طہارت کے ساتھ سفر کیا۔ آپ نے اپنے بھائی حضرت محمد حنفیہؓ کو وصیت کرتے ہوئے یہ تحریر رقم کی:

إِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَلَا بَطِراً وَلَا مُفْسِداً وَلَا ظَالِماً وَإِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ۔

میں اکڑتے اور اتراتے ہوئے ازروئے غرور و تکبر نہیں نکل رہا ہوں اور نہ ہی میرا مقصد فساد پھیلانا اور کسی پر ظلم ڈھانا ہے بلکہ میرے مدینے سے روانہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنے جد (رسول اللہ) کی اُمت میں اصلاح کروں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دوں۔ اس وصیت سے امام حسین علیہ السلام کا مدعا اور مقصدِ سفر واضح ہو جاتا ہے۔ اور شبِ عاشور قلادۂ بیعت ہٹا کر ہر ایک کو چلے جانے کی تلقین کرتے ہیں۔

۲۸۔ دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتعد
دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

امام حسین علیہ السلام کے دشمن صحرا کی ریت کی طرح لاتعداد اور ان گنت تھے اور ان کے رفقاء اور احباب کی تعداد یزداں کے عدد کے برابر تھی۔ ابجد کے حساب سے یزداں کے عدد 72 ہوتے ہیں یہاں یزداں کا لفظ لاکر اقبال نے گویا امام حسین علیہ السلام کی جماعت کو" حزب اللہ" یعنی اللہ کا گروہ کہا ہے۔ یزداں فارسی زبان میں خدا کو کہتے ہیں جس طرح اہرمن شیطان کو کہا جاتا ہے۔

اقبال نے یزیدی فوج (دشمنوں) کی تعداد کو **لاتعد** یعنی ناقابل شمار کہہ کر صحرا کی ریت سے تشبیہ دی ہے جو ایک نادر تشبیہ ہے۔ عقل قاری اس کو فوراً سمجھ لیتی ہے یہ تشبیہ برمحل اور برجستہ ہونے کا بہترین نمونہ ہے۔ لاتعد کہنے کا سبب یہ بھی ہے کہ آج تک یزیدی فوج کی صحیح تعداد کا حتمی تعین نہیں ہوسکا۔ جو روایات ہیں ان میں کم سے کم تعداد تیس ہزار اور زیادہ کی کوئی حد نہیں وہ لاکھوں پر محیط ہے اور علامہ اقبال نے انصار و احباب امام حسینؑ کی تعداد کو نہایت حسین پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ان کی تعداد یزداں کے اعداد کے مطابق ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو روز عاشور امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تھے جو لوگ یزیدی لشکر کو چھوڑ کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں آگئے وہ اس تعداد میں شامل نہیں۔

۲۹۔ سرّ ابراہیم و اسماعیل بود
یعنی آن اجمال را تفصیل بود

اس شعر میں علامہ کا اشارہ حضرت ابراہیم کا حضرت اسماعیلؑ کو بحکم الہی (اگرچہ وہ خواب کے عالم میں تھا) قربان کرنے کے لیے دل جمعی سے آمادہ ہونے کی طرف ہے جس کو پروردگار نے" **وفدیناہ بذبح عظیم و ترکنا علیہ فی الآخرین** " کہہ کر معاشر فرمایا۔ اقبال نے اسے سرّ ابراہیم و اسماعیل سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کے مطابق جب امام حسینؑ نے میدان کربلا میں اپنے اہل وعیال رفقاء وجاں نثاروں کی قربانی پیش کی" بہر حق درخاک وخون غلطیدہ است" تو اقبال کہہ اٹھے کہ سرّ ابراہیم جو اجمالی یعنی مختصراً تھا اس کی یہ تفصیلی تصویر سامنے آگئی۔ ایک اور جگہ بھی اقبال نے قربانی خلیل کو ابتدا اور قربانی حسین کو

انتہا قرار دیا ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ امام حسین بھی نسلاً حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں اس لیے وہ وترکنا علیہ فی الآخرین کے مصداق بن گئے۔

۳۰۔ عزم او چوں کوہساراں استوار
پایدار و تند سیر و کامگار

حضرت امام حسین علیہ السلام کا عزم پہاڑوں کی طرح استوار اور محکم ہے۔ اس شعر میں اقبال نے عزم کی چار صفتیں بیان کی ہیں۔ پہلی صفت استوار ہے یعنی مضبوط ہے۔ دوسری صفت پائیدار یعنی مستقل ہے۔ تیسری صفت تند سیر، تیز رفتار اور چوتھی صفت کامگار یعنی کامیاب ہے۔ اور یہ تمام صفات امام حسین علیہ السلام کی ہستی میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

۳۱۔ تیغ بہر عزت دین است و بس
مقصدِ او حفظ آئین است و بس

اقبال کے نزدیک تیغ (شمشیرزنی) عزت دین کے لیے ہے اور بس اس کا مدعا و مقصد آئین یعنی اسلام کے منشور کی حفاظت کے سوا کچھ نہ تھا حصول جاہ و منصب، اقتدار و اختیار حاصل کرنا امام کا مقصد نہ تھا بلکہ آئین اسلام اور دستور قرآن کی حفاظت تھی۔ اگر وہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے تو اس کے لیے اطراف و اکناف عالم سے لشکر اور فوج اکٹھی کرتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ وہ لوگوں سے یہی کہتے رہے میں تنہا اس محاذ پر یزید سے مقابلہ کروں گا۔ اس لیے کہ وہ میرا دشمن ہے۔

۳۲۔ ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

مسلمان عبدِ خدا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کسی اور کا غلام اور بندہ نہیں ہے۔ کسی بھی فرعون سے مراد یہاں طاغوتی طاقتیں ہیں جن کے سامنے اُس کا سر خمیدہ نہیں ہے۔ جو سر اللہ کے حضور جھک جاتا ہے، جو پیشانی سجدۂ خالق کے لیے سرنگوں ہوتی ہے وہ پھر ماسوا اللہ کے آگے خم نہیں ہوتی۔ ایک سجدہ جو انسان اللہ کے حضور میں کرتا ہے وہ اسے ہزاروں سجدوں سے نجات دلاتا ہے۔ اس شعر میں علامہ اقبال نے عبدیت کے فلسفے کی وضاحت کی ہے کہ عبدِ خدا ہونا بڑے نصیب کی بات ہے۔ عبد ہونا کوئی معمولی منصب نہیں بلکہ اس کی عظمت یہ ہے کہ جب ہم تشہد پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آغوشِ مادر میں کہا تھا:

إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا (سورۂ مریم۱۹: ۳۰)

میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے لیے فرمایا:

إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷: ۳)

بے شک نوح بے حد شکر گزار بندے تھے۔

۳۳۔ خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد
ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

امام حسین علیہ السلام کے خون نے ان رازہائے سربستہ کی تفسیر بیان کر کے سوئی ہوئی اُمت اور ملتِ خوابیدہ کو جگایا ہے۔ علامہ اقبال اس شعر میں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے ریگزارِ کربلا میں اپنی اور اپنے احباب و اقرباء کی جان کا نذرانہ پیش کر کے اور اسلام کی بقا اور دین کی سلامتی اور آئین و دستور و قانون کی حفاظت کے لیے اپنا خون بہا کر اُن رازہائے پنہاں اور اسرارِ نہاں سے پردہ اٹھایا ہے کہ اگر عزم جوان ہو اور مقصد اعلیٰ ہو تو کوئی بھی طاقت حق و صداقت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ باطل خواہ کتنی ہی طاقت رکھتا ہو،

کتنی ہی بڑی فوج اور لشکر کا مالک کیوں نہ ہو۔ وہ حق کو شکست نہیں دے سکتا۔

۳۴۔ تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید
از رگ ارباب باطل خوں کشید

حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب "لا" (نہیں) انکار بیعت کی تلوار نیام سے باہر نکال لی تو اس تلوار نے ارباب باطل کی رگوں سے تمام خون کھینچ کر باہر نکال دیا۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں علامتی زبان استعمال کی ہے اور استعارے کے طور پر کہا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے ظالم و جابر حاکم کے سامنے "لا" کہہ کر انکار بیعت کیا تلوار میان سے نکالی تو رگ ارباب باطل سے خون نکال لیا۔ اقبال نے پہلے مصرع میں لفظ "لا" اور دوسرے مصرع میں ارباب باطل لا کر "لا الٰہ" کو واضح کیا ہے۔

۳۵۔ نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

امام حسین علیہ السلام نے تیغ لا سے باطل کا سر قلم کر کے اسے شکستِ فاش دے کر الا اللہ کا نقش صحرائے کربلا پر رقم کر دیا اور یہ تحریر گویا کہ ہماری نجات اور رستگاری کی تحریر تھی۔ یہاں لفظ "ما" سے مراد علامہ اقبال صرف اپنی نجات نہیں لیتے بلکہ کل اُمّت مسلمہ کی نجات و رستگاری کہنا مقصود ہے۔

مکمل کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ یہ کلمۂ توحید ہے۔ لا سے الا تک کا سفر طے کرتا ہے۔ جب تک انسان "لا" نہ کہے وہ "الا" تک رسائی نہیں پا سکتا۔ سب سے پہلے انکار ہے اس کے بعد اقرار ممکن ہے۔ تمام معبودان باطل اور خود ساختہ خداؤں کا انکار کرنے کے بعد خدائے واحد کا اقرار ممکن ہے۔ اسی بات کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ

(سورۃ البقرہ ۲:۲۵۶)

اب جو بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا تو گویا وہ اس مضبوط رسی سے

متحسنك ہوگیا ہے۔

انسانوں نے جتنے بھی بت تیار کیے ہیں اور اصنام سجا رکھے ہیں ان سب کو منہدم کرنا ہوگا۔ ان سب کا انکار کرنا ہوگا۔ (60) ھ میں کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ "لا یزید" کہتا۔ یزید کا انکار کرتا۔ اس کی طاقت وقوت کو تسلیم نہ کرتا مگر حضرت امام حسین علیہ السلام نے کلمہ "لا" کہ کر اس تیغ سے یزید کے منصوبوں کو ختم کردیا اور اس طرح الا اللہ کا نقش سرزمین کربلا پر اپنے خون سے لکھ دیا یعنی کربلا کی جنگ درحقیقت اسلام کی بقا اور قرآن کی حفاظت کی جنگ تھی اور حضرت امام حسین علیہ السلام ریگزار کربلا پر اپنے خون سے ہماری نجات، کامیابی اور کامرانی کی تحریر رقم کر رہے تھے۔

۳۶۔ رمزِ قرآن از حسین آموختیم
زآتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

ہم نے قرآن کا راز اور رمز حضرت امام حسین علیہ السلام سے سیکھا ہے اور انھی کی حرارت ایمانی اور آتش عرفانی سے یہ شعلے اکٹھے کیے ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام وارث قرآن ہیں، مفسر قرآن ہیں، محافظ قرآن ہیں، ان کی پوری زندگی قرآن کی تفسیر اور تعبیر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي۔ (صحیح مسلم حدیث نمبر 2408)

میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور اپنی عترت جو میرے اہل بیت ہیں اور حضرت امام حسین علیہ السلام اہل بیت کے ایک فرد ہیں تو یہ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ قرآن کریم نے ہمیں جو حریت فکر اور آزادی رائے اور ظلم وجبر کے خلاف جہاد کا حکم دیا ہے، حضرت امام حسین علیہ السلام نے اسے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان سے سبق لیں، ان کا اتباع کریں، ان کی زندگی کو مشعل راہ بنائیں اور ان کے اندر جو جذبہ کارفرما تھا اور جو ایمان وایقان اور عمل وکردار کے شعلے بھڑک رہے ہیں ہم بھی اس سے

استفادہ کریں اور حق وحریت، آزادی اور صداقت کے لیے ہر باطل قوت سے ٹکرانے کے لیے تیار اور آمادہ ہوجائیں۔

۳۷۔ شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت

علامہ اقبال اس شعر میں تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ذرا تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھو۔ ایک زمانہ تھا جب شام اپنے عروج پر تھا، تہذیب کا مرکز تھا، تجارت کا محور تھا، مکہ سے قافلے یہاں آ کر تجارت کیا کرتے تھے۔ رِحلَةَ الشتاءِ والصيف اس پر گواہ ہے اور بغداد بھی اسی شان وشوکت کا مالک تھا کہ اسے عروس البلاد کہا جاتا تھا اور عبدالرحمن ثانی نے جب اندلس پر فتح کے جھنڈے گاڑ دیے تو وہاں کا شہر غرناطہ تہذیب اسلامی اور تمدن دینی اور علم وہنر کا پائے گاہ بن گیا۔ اس کی شان وشوکت اور سطوت وحشمت کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ وہاں کی عمارتیں اور مساجد آج بھی ان کی ترقی کی گواہی دے رہی ہیں۔

یہ سب شہر شام ہو یا بغداد یا غرناطہ اپنے زمانے میں مشہور تھے اور اب صرف اس کی داستانیں باقی رہ گئی ہیں یا اس کے کھنڈرات اس ترقی یافتہ دور کو یاد دلا کر اس کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں اور نوحہ کناں ہیں۔ یہ سب کے سب صرف ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں اور صرف ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس کے بعد والا شعر اس کا جواب ہے۔

۳۸۔ تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی وہ واقعہ تازہ ہے۔ ابھی تک اس کے نقوش مدھم نہیں پڑے۔ اس کے اثرات زائل نہیں ہوئے۔ یہ عظیم قربانی آج بھی ذہنوں اور فکروں کو متاثر کر رہی ہے۔ ہر مصلح اور رفارمر، آزادی کا ہر داعی انہی کے نقش قدم پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ گاندھی بھی اگر آزادی کی تحریک چلانا چاہتے ہیں تو 72

افراد کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے 72 ساتھیوں کے ساتھ حق و صداقت کا دیا جلایا اور پرچم حق کو بلند کیا تھا۔ میں نے بھی آزادی حاصل کرنے کے لیے اسی تعداد کو اپنایا ہے۔

ہمارے سازِ زندگی کا تار حضرت امام حسین علیہ السلام کے مضراب سے ابھی بھی لرز رہا ہے اور ان کی تکبیر کے نعروں سے ابھی تک ایمان میں تازگی اور بالیدگی پائی جاتی ہے۔

علامہ اقبال اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری حیات کا سفینہ جو رواں دواں ہے اور ہماری کشتی حیات جو منزل کی جانب گامزن ہے یہ سب امام حسین علیہ السلام کا کرم ہے۔ انھوں نے جام شہادت نوش کر کے ہمیں پیام زندگی دیا، نوید حیات سنائی۔ آج جو مساجد سے اذان کی آوازیں آرہی ہیں، آج جو کعبہ کا طواف کیا جارہا ہے وہ سب امام حسین علیہ السلام کا فیض ہے جو جاری و ساری ہے۔ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام کربلا کے بن میں نماز قائم نہ کرتے اور اعلائے کلمۂ حق کے لیے جان قربان نہ کرتے تو آج دنیا سے اسلام رخصت ہو جاتا۔ قرآن کی تعلیمات پس پشت ڈال دی جاتیں اور اسلام کا چہرہ مسخ ہو جاتا۔ حضرت زین العابدین علیہ السلام جب دربار یزید میں خطبہ دے رہے تھے اور خطبۂ امام کو منقطع کرنے کے لیے بے وقت اذان دی گئی تو امام زین العابدین علیہ السلام نے موذن سے کہا۔ محمد رسول اللہ کا واسطہ! ذرا رک جاؤ اور مجھے گفتگو کرنے دے۔ پھر یزید سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے یزید! یہ بتا اذان میں جن کا نام لیا جارہا ہے یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے جد تھے یا میرے جد ہیں۔ اگر تو کہتا ہے کہ تیرے جد تھے تو جھوٹ بولتا ہے اور اگر اقرار کرتا ہے کہ وہ میرے جد ہیں تو پھر ان کے نواسے کو کیوں قتل کیا اور ان کی نواسیوں کو اسیر کر کے کیوں دیار بہ دیار پھرایا گیا۔

اسی اذان کو بچانے کے لیے اور نماز کی حفاظت کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام نے جان دی تھی۔ اس شعر کے مصرع:

"تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز"

کا یہی مقصد ہے۔

آخری شعر اس نظم کا یہ ہے۔

۳۹۔ اے صبا اے پیک دور افتادگاں

اشک ما بر خاک پاک او رساں

اقبال کی یہ نظم اگرچہ صنف مثنوی میں لکھی گئی ہے مگر اس کا انداز روایتی قصیدے کا ہے قصیدے میں شاعر ابتدا مضمون سے مطابق کچھ شعر لکھتا ہے جسے تشبب کہا جاتا ہے اس کے بعد وہ مدح ممدوح کرتا ہے اور پھر آخر میں التجا یا دعا کرتا ہے اور غرض وغایت بیان کرتا ہے یہ آخری شعر علامہ اقبال کے مدعا کا غماز ہے وہ کربلا سے جسمانی طور سے دور ہیں اور اس لیے وہاں جا کر آنسوؤں کا نذرانہ ان کے مرقد پر پیش نہیں کر سکتے اس لیے وہ صبا کو نامہ بر بنا کر کہتے ہیں: اے باد صبا! اے دور رہنے والوں کی پیامبر! تو ہمارے آنسوؤں کی سوغات حضرت امام حسین علیہ السلام کی پاک خاک تک پہنچا دے۔ اکثر شعراء نے باد صبا کو ایلچی، قاصد اور پیام رساں قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک پیغام بھیجنے کا سب سے تیز رفتار اور محفوظ ذریعہ ہوا ہے جسے باد صبا کہا گیا ہے۔

☆☆☆

در معنیٔ ایں کہ سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا

اسوۂ کاملہ ایست برائے نساء اسلام

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز
نورِ چشمِ رحمۃٌ لِلعالمین
آں امامِ اوّلیں و آخریں
آں کہ جاں در پیکرِ گیتی دمید
روزگارِ تازہ آئیں آفرید
بانوئے آں تاجدارِ ہل اتیٰ
مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوانِ او
یک حسام و یک زرہ سامانِ او
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
آں یکے شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیتِ خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
پشتِ پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں
قوتِ بازوئے احرارِ جہاں

در نوائے زندگی سوز از حسین
اہلِ حق حریت آموز از حسین

سیرتِ فرزندہا از اُمّہات
جوہرِ صدق و صفا از امہات

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودے چادرِ خود را فروخت

نوری و ہم آتشی فرمانبرش
گم رضایش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامانِ نماز

اشکِ او برچید جبریل از زمیں
ہمچو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفےٰ است

ورنہ گردِ تربتش گردیدمے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

درمعنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا اسوۂ کاملہ ایست برائے نساء اسلام
اس مفہوم میں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا مکمل نمونہ ہیں اسلام سے تعلق

رکھنے والی خواتین کے لیے۔

یہ نظم مثنوی اسرار و رموز یعنی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی کے ص ۱۷۷۔۱۷۸ پر ہے۔

اس نظم میں کل ۱۹ شعر ہیں اور یہ نظم بڑی مُرصّع ہے اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے تعلق رکھنے والی اور ان کے فضائل، محامد اور محاسن پر نہایت خوب صورت نظم ہے جو نادر معانی و مفاہیم پر مشتمل اور حقائق و معارف پر مبنی ہے۔

۱۔ مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز

از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

حضرت مریمؑ کے لیے شرف و منزلت کی صرف ایک نسبت ہے یعنی وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدۂ گرامی ہیں لیکن حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی فضیلت اور عظمت تین نسبتوں سے ثابت ہے جسے بعد میں آنے والے اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔

''قارئین کرام کی سہولت کے لیے ہم حضرت مریمؑ کی فضیلت کے اسباب وعلل اور پس منظر بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔''

قرآن کریم کا ۱۹ واں سورہ سورۂ مریم کے نام سے موسوم ہے۔ اس سورہ کی اہمیت یہ ہے کہ جب حضرت جعفر طیارؓ ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئے تھے تو وہاں کے بادشاہ نجاشی کی فرمائش پر انھوں نے یہی سورہ اسے سنایا تھا جسے سننے کے بعد وہ مسلمان ہو گیا تھا۔

حضرت مریمؑ کی والدہ حنہ نے نذر مانی تھی کہ

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (سورۂ آل عمران ۳:۳۵)

اس وقت کو یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا کہ میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے، تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی لیے وقف ہوگا۔ میری اس پیشکش کو قبول فرما لے۔ بے شک تو ہر ایک کی سننے والا اور ہر بات کو جاننے والا ہے۔

ولادت کے بعد لڑکی ہونے کے باوجود اللہ نے حنہ کی نذر قبول کر لی اور حضرت زکریا جو

ان کے خالو تھے انھیں کفیل بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی جنھیں اللہ تعالیٰ نے نبی، رسول اور اولو العزم بنایا تھا اور انھیں روح اللہ کا لقب ملا اور ان پر جو کتاب نازل ہوئی اس کا نام انجیل تھا اور انھیں متعدد معجزات سے اللہ نے نوازا تھا۔

حضرت مریم معصومہ، طاہرہ اور بتول تھیں اور حضرت عیسیٰ کی والدہ ہونے کی وجہ سے آپ کو کائنات کی عورتوں پر فضیلت اور برتری حاصل ہے۔

لیکن ان کے مقابل میں اگر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا پر نظر کریں تو ان کی فضیلت تین نسبتوں سے ثابت ہے۔ باپ کی نسبت، شوہر کی نسبت اور فرزندوں کی نسبت سے، جیسا کہ بعد میں آنے والے اشعار کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

؎ نور چشم رحمۃ للعالمین
آن امام اولین و آخرین

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نور چشم ہیں، دختر نیک اختر ہیں اس عظیم ہستی کی جو رحمۃ للعالمین کے لقب سے ملقّب ہیں یعنی احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اولین سابقین کے بھی امام ہیں اور بعد میں آنے والے اور آخری زمانے سے تعلق رکھنے والوں کے بھی امام، رہبر اور قائد ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ تاریخ ادیان ماسبق بھی ہیں تمام انبیائے کرام جو ان سے پہلے تشریف لائے تھے ان سب پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی ہے۔

ارشاد رب العزت ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ (سورۃ الانبیاء۲۱: ۱۰۷)

اور ہم نے اے نبی! آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝ (سورۃ التوبہ۹: ۱۲۸)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمھارے بارے میں حریص ہیں کہ تم مومن بن جاؤ اور مومنین پر مشفق اور مہربان ہیں۔ اللہ رؤف اور رحیم ہے۔ اس نے اپنی صفت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کر دی اور انھیں بھی رؤف و رحیم کہا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء دنیا میں بھیجے ہیں جن میں سے ۳۱۳ رسول ہیں اور ان میں سے پانچ اولو العزم پیغمبر ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ہمارے نبی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سید الانبیاء والمرسلین اور خاتم النبیین بنایا ہے اور آپؐ کو پوری کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ آپ ہی کی تشریف آوری کے لیے آسمان کا سائبان بنایا، زمین کا فرش بچھایا، آفتاب و ماہتاب کی قندیلیں روشن کیں اور ستاروں سے کائنات کو مزین اور آراستہ کیا۔ جبھی تو حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا: لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ، اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ۔

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا رسول اسلام کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی تعظیم فرماتے تھے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے اور انھیں اُمِّ اَبِیْھَا کے لقب سے نوازا تھا۔ آپؐ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے چہرۂ اقدس میں جنت کی خوشبو سونگھتے تھے۔ وہ آپؐ کی پارۂ جگر اور نورِ نظر اور قلبِ المصطفیٰ ہیں۔ امام البخاری نے الصحیح البخاری کی حدیث نمبر 3717 باب مناقب فاطمۃ میں یہ روایت نقل کی ہے:

فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي فَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِي۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جس نے اس کو غضب ناک کیا اس نے مجھے غضب ناک کیا۔

علامہ اقبال نے حضور پرنور کو اولین اور آخرین کا امام قرار دیا ہے اس لیے کہ وہ ہر نبی رسول اور ولی کے امام، قائد، رہنما اور رہبر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج پر طلب کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت المقدس سے گزرے تو آپ نے وہاں امامت کے فرائض انجام

دیے اور تمام انبیاء نے آپ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کی۔ لہٰذا آپ گزشتگان کے بھی امام ہیں اور آیندگان کے بھی امام ہیں اس لیے کہ اگر کوئی آج بھی مسلمان ہوتا ہے تو یہی کلمہ پڑھتا ہے: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی رسالت آج بھی جاری ہے اور تا قیامِ قیامت آپ کی رسالت جاری و ساری رہے گی۔

۳۔ آں کہ جاں در پیکرِ گیتی دمید
روزگار تازہ آئیں آفرید

علامہ اقبال نے اس شعر میں حضور سرورِ کائنات، فخرِ موجودات کا ذکرِ جمیل اس انداز میں کیا ہے کہ ہمارے نبی وہ مقدس ہستی ہیں جنھوں نے پیکرِ گیتی یعنی دنیا میں جان ڈال دی، روحِ زندگی پھونک دی اور زندگی کے لیے آئین اور دستور بنایا جس نے عرب کو جہالت اور کفر و شرک کے اندھیروں سے نکالا۔ اسلام اور ایمان کے نور سے ان کے قلوب کو منور اور فروزاں کیا۔ جاہلیت کی رسموں کو توڑا، اصنام پرستی کو ختم کیا۔ رنگ و نسل اور عربی و عجمی کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی اور فرمایا: لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِاَبْيَضَ عَلٰى اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ کے یعنی فضیلت تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ حسب نسب اور رنگ و نسل اور خاندان و نژاد کی بنیاد پر نہیں ہے۔

۴۔ بانوے آں تاجدارِ ھل اتیٰ
مرتضیٰ، مشکل کشا، شیرِ خدا

اب علامہ اقبال جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی فضیلت اور عظمت کی دوسری نسبت بیان کر رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا زوجہ ہیں اس عظیم اور محترم ہستی کی جو اپنے سر پر ھل اتیٰ کا تاج سجائے ہوئے ہے۔ جو اقلیم ھل اتیٰ کا تاجدار ہے۔

اس مصرع میں اشارہ ہے سورۂ دھر کی طرف جو سورۂ الانسان اور سورۂ ''ھل اتیٰ'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس سورۂ میں پانچ ہستیوں کے ایثار کا تذکرہ ہے۔ ان تمام ہستیوں اور افراد

کے سرخیل امیر المومنین امام المتقین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال نے انھیں تاجدارِ ہل اتیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ مولا علی کا معروف لقب ہے اور اسے شعراء نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حسنین کریمین بیمار ہو گئے۔ رسول اکرم ﷺ عیادت کے لیے تشریف لائے اور حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو یہ مشورہ دیا کہ وہ نذر مانیں کہ بچوں کی صحت یابی کے بعد وہ تین دن روزے رکھیں گے۔ ان دونوں نے نذر مان لی۔ بچے جب تندرست ہو گئے اور انھوں نے نذر پوری کرنے کے لیے تین دن روزے رکھے تو امام حسن علیہ السلام و امام حسین علیہ السلام اور ان کی کنیز فضہ بھی روزہ رکھنے والوں میں شامل ہو گئے۔ قرآن کریم نے اس امر کو اس طرح بیان کیا ہے:

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ (سورۃ الدھر ۷۶: ۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوگی۔

جب انھوں نے روزے رکھے اور افطار کا وقت آیا تو انھوں نے بھوک کے باوجود اپنا اپنا کھانا پہلے دن مسکین کو، دوسرے دن یتیم کو اور تیسرے دن اسیر کو کھلا دیا اور خود بھوکے رہے۔ قرآن نے اس طرح اس واقعے کی حکایت کی ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ (سورۃ الدھر ۷۶: ۸)

اور وہ طعام کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (8 الدھر 76) اور وہ فرماتے ہیں جسے قرآن نے نقل کیا: (9 الدھر 76)

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ (سورۃ الدھر ۷۶: ۸)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم تمھیں اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے کسی جزا یا شکریے کے طلب گار نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے اس عمل کو اتنا محبوب جانا کہ گیارہ آیتوں میں ان پر انعامات و اکرام کا تذکرہ کیا اور بارھویں آیت نمبر 22 میں فرمایا: (سورۃ الدھر ۷۶: ۲۲)

إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ۝

یہ تھی تمھاری جزا اور تمھاری سعی قابلِ قدر ہے۔

دوسرے مصرع میں علامہ اقبال نے حضرت علی علیہ السلام کے تین القاب کا ذکر کیا ہے جو بہت مشہور ہیں اور عوام میں بے حد مقبول ہیں۔

پہلا لقب جو نام کا جزو بن گیا ہے وہ لفظ "مرتضیٰ" ہے۔ یہ لفظ عربی مادے رضا سے نکلا ہے۔ اس کا مفہوم ہے جسے پسندیدہ قرار دیا گیا ہو۔ غالباً اس آیت کی طرف اشارہ ہے: (بقرہ ۲:۲۰۷)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۝

اور انسانوں میں وہ شخص ہے جو اللہ کی رضامندی کے لیے اپنے نفس کو فروخت کردیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اسی آیت کی وجہ سے علی کو مرتضیٰ کہا جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے جو دوسری صفت بیان کی ہے وہ مشکل کشا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام لوگوں کی مشکلات حل کیا کرتے تھے۔

واخرج عن سعید بن المسیب قال: کان عمر بن الخطاب یتعوذ باللہ من معضلۃ لیس فیھا ابو حسن۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص 142)

سعید ابن المسیبؒ سے روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ اللہ کی پناہ طلب کیا کرتے تھے ایسی مشکلات سے جس کے حل کرنے کے لیے ابو الحسن علی المرتضیٰ علیہ السلام نہ ہوں۔ اسی لیے انھوں نے متعدد بار فرمایا: لولا علی لھلک عمر۔ اگر علی (علیہ السلام) نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا۔

اور تیسری صفت جس کا ذکر علامہ اقبال نے کیا ہے وہ "شیرِ خدا" ہے۔ اسے عربی میں اسد اللہ کہتے ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کی والدۂ ماجدہ نے ان کا نام حیدرہ رکھا تھا اور حیدرہ شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر جب حضرت علی علیہ السلام مرحب کے مقابلے کے لیے آئے تھے تو اس نے یہ رجز پڑھا تھا:

قد علمت خیبر انی مرحب

شاک فی السلاح بطل مجرب

تو اس کے جواب میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ

کلیث غابات شدید قسورہ

اکیلکم بالسیف کیل السندرہ

زینی دحلان سیرت نبویہ جلد 2 ص 201 میں فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے حیدر نام اس لیے بیان کیا کہ مرحب نے ایک خواب دیکھا تھا کہ شیر نے اسے حملہ کرکے چیر پھاڑ دیا ہے۔ یہ حضرت علی علیہ السلام پر کشف ہوا تھا۔ اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام نے اپنا یہ نام مرحب کے سامنے "حیدرہ" کہا اور یہ شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے کہ یہ وہی اسد ہے جو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ جب مرحب نے حضرت علی علیہ السلام کا یہ نام سنا تو وہ کانپنے لگا اور اس نے خود کو کمزور پایا۔

۵۔ پادشاہ و کلبۂ ایوان او

یک حسام ایک زرہ سامان او

علامہ اقبال اس شعر میں فرماتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حیثیت وہی ہے جو ایک بادشاہ کی ہوتی ہے۔ وہ 54 ملکوں کے حکمران ہیں لیکن ان کا ایوان حکومت نہایت معمولی ہے جو چھوٹا سا گھر ہے۔ ایک معمولی کٹیا ہے اور اگر ان کے ساز و سامان پر نظر کرو تو ان کے پاس ایک تلوار اور ایک زرہ ہے جو ایک بہادر کا زیور ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اسی سادگی و پرکاری کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

ضرار بن ضمرہؓ جو حضرت علی علیہ السلام کے صحابی تھے، ان سے امیر شام نے فرمائش کی کہ حضرت علی علیہ السلام کے فضائل بیان کرو تو انھوں نے کہا مجھے معاف رکھئے تو بہتر ہے۔ معاویہؓ نے کہا تمھیں کچھ تو کہنا ہوگا۔ ضرارؓ نے کہا اگر تم ان کے اوصاف سننا چاہتے ہو تو سنو۔ خدا کی قسم! وہ ایسے صاحب عزت ہیں جن کے مقام تک رسائی دشوار ہے۔ وہ بڑی قوت و طاقت کے مالک تھے، ہمیشہ فیصلہ کن بات کہتے اور عدل کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔ ان

کے اطراف وجوانب سے علم کے چشمے پھوٹتے تھے اور ان کی رفاقت سے دانائی کو گویائی ملتی تھی۔ وہ دنیا اور اس کی چہل پہل سے گھبراتے تھے۔ رات اور اس کی تنہائی سے مانوس تھے، اکثر گریہ کناں اور فکر میں غلطاں رہتے تھے۔ آپؑ کو وہ لباس پسند تھا جو ارزاں ہو اور وہ کھانا محبوب تھا جو سادہ ہو، وہ ہمارے درمیان اس طرح رہا کرتے تھے جیسے ہم ہی میں سے ایک ہوں۔ ہم جب بھی سوال کرتے وہ اس کا جواب دیا کرتے تھے اور اتنی قربت کے باوجود ان کی ہیبت کی وجہ سے ہمیں ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ دین داروں کی عزت کرتے، مسکینوں کو قربت بخشتے تھے۔ کوئی طاقتور ان سے غلط کام کی اُمید نہیں رکھ سکتا تھا اور کوئی کمزور ان کے عدل سے نااُمید نہیں ہوتا تھا۔

(1) صواعق محرقہ ص 201-202 ابن حجر مکی ہیثمی متوفی (974ھ) مطبوعہ بیروت)

(2) الجواہر الثمین ص 51-52 ابن دقماق متوفی 809ھ مطبوعہ مملکت عربیہ سعودیہ، جامعہ اُم القریٰ۔

۲۔ مادر آں مرکز پرکار عشق
مادر آں کارواں سالار عشق

علامہ اقبال حضرت فاطمہ بتول عذرا کی توصیف وتعریف کی طرف لوٹتے ہیں اور اس طرح گویا ہوئے ہیں کہ وہ حضرت حسن علیہ السلام کی مادر گرامی ہیں۔ یعنی وہ حسن جو پرکار عشق کا مرکز ہیں اور دوسرے مصرع میں امام حسین علیہ السلام کی نشان دہی کر کے فرمایا۔ یہ اس عظیم ہستی کی ماں ہیں جو مدینۂ منورہ سے عشق کا کارواں لے کر روانہ ہوا تھا اور وہ کاروانِ عشق ومحبت کا سالار ہے۔

حضرت حسن علیہ السلام وامام حسین علیہ السلام قرآن کی رو سے فرزند رسول ہیں۔ یہ کوثر کی تفسیر ہیں اور نسلِ پیغمبر انہی دونوں نواسوں سے آگے بڑھی ہے۔ حضرت حسن علیہ السلام کے لیے ارشاد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

اِبْنِی ھٰذَا سَیِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰہَ اَنْ یُّصْلِحَ بِہٖ بَیْنَ فِئَتَیْنِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

(صحیح بخاری: حدیث نمبر 3746)

میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کے ذریعے مسلمان کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرادے۔

امام حسن علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: لَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَشْبَهَ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ۔ (صحیح بخاری: حدیث نمبر 3752)

کوئی بھی حضرت حسن علیہ السلام بن علی علیہ السلام سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے مشابہت نہ رکھتا تھا۔

امام حسن علیہ السلام و امام حسین علیہ السلام دونوں کے لیے فرمایا:

هما ريحانتاي من الدنيا۔ (صحیح بخاری: حدیث نمبر 3753)

یہ دونوں (یعنی حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام) دنیا میں میرے دو گل تر ہیں۔

حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ یہ فرشتہ پہلی مرتبہ زمین پر نازل ہوا ہے اور مجھے بشارت دے رہا ہے کہ:

فاطمة سيدة نساء اهل الجنة وان الحسن والحسين سيدا شباب اهل الجنة۔ (صحیح ترمذی شریف: حدیث نمبر 3790)

حضرت فاطمہ (سلام اللہ علیہا) جنتی عورتوں کی سردار ہیں اور یہ کہ حسن حسین دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔

علامہ اقبال نے حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو بہ حیثیت ماں کے متعارف کرایا ہے جو کسی عورت کا تیسرا کردار ہے۔ پہلا کردار بیٹی کی حیثیت سے، دوسرا بیوی کی حیثیت سے اور تیسرا ماں کی حیثیت سے ہے۔

؎ آں کے شمع شبستان حرم
حافظ جمعیت خیر الامم

ان میں سے ایک بیٹا شبستان حرم کی شمع ہے اور بہترین اُمت یعنی اُمتِ مسلمہ کی جمعیت اور اتحاد کا محافظ ہے۔

شبستانِ حرم کی شمع سے مراد ہے جس کے دم سے مسجد اقصیٰ اور مسجد الحرام کی رونق اور روشنی ہے۔ دوسرے مصرع میں اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ امام حسن علیہ السلام خیر الامم یعنی مسلمانوں کے اتحاد اور یگانگت کے محافظ ہیں۔ یہ صلح امام حسن علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعے امت کا شیرازہ بکھرنے سے بچ گیا۔

قرآن کریم میں اُمت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیر اُمّت کہا گیا ہے اسی لیے علامہ اقبال نے انھیں اپنے شعر میں خیر الامم کہا ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (سورۂ آل عمران ۳: ۱۱۰)

"تم بہترین اُمت ہو جنھیں دوسرے لوگوں کے لیے لایا گیا ہے۔"

۸۔ تا نشیند آتش پیکار و کیں
پشت پا زد بر سر تاج و نگیں

یہ شعر پہلے شعر سے متصل ہے۔ امام حسن علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں۔

تاکہ اُمت میں جنگ وجدال اور دشمنی کی آگ سرد ہو جائے، آگ بجھ جائے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے تخت وتاج کو ٹھوکر ماردی۔ صلح کے ذریعے حکومت واقتدار کو اپنے مخالف کے حوالے کردیا اور خود حکومت سے دستبردار ہو گئے اور اس کے لیے صلح نامہ تحریر کیا گیا جو تاریخ کی کتابوں میں مرقوم اور موجود ہے۔ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے صلح حدیبیہ کی تاسی میں صلح کرلی جو صلح حسن کے نام سے موسوم ہے۔ آپ نے امیر شام کا اصلی چہرہ دکھانے کے لیے صلح کا پیغام بھیجا اور انھوں نے سادہ کاغذ دستخط کرکے روانہ کردیا کہ آپ جو شرطیں تحریر کریں گے وہ مجھے قبول ہوں گی۔ امام حسن علیہ السلام نے حسب ذیل شرائط لکھ کر بھیج دیں۔

1۔ حکومت معاویہ کے ہاتھ میں رہے گی بشرطیکہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل کریں۔

2۔ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو ولی عہد نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ (اصابہ، الامامۃ والسیاسۃ)

3- اہلِ عراق کو عمومی طور پر امن وامان ملے گا۔ (حیوۃ الحیوان)

4- امیر شام خود کو امیر المومنین نہیں کہیں گے۔ (تذکرہ خواص الامہ)

5- حضرت علی علیہ السلام پر سب وشتم بند کی جائے گی۔ (شرح نہج البلاغہ)

6- ہر صاحب حق کو اس کا حق دیا جائے گا۔ (مناقب ابن شہر آشوب)

7- بیت المال کوفہ حضرت حسن علیہ السلام کے قبضے میں رہے گا۔ (تاریخ دول الاسلام)

8- معاویہ سالانہ دس لاکھ درہم ادا کریں گے۔ (جوہرۃ الکلام)

9- امام حسن علیہ السلام کے ذمے جو قرض ہے اسے معاویہ ادا کریں گے۔ (تاریخ الخلفاء)

10- مدینہ، عراق اور حجاز کے باشندوں سے مزید ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ (تاریخ الخلفاء)

نوٹ: امام حسن علیہ السلام ماہ ربیع الاول 41ھ میں اور بقول بعض ربیع الثانی 41ھ میں خلافت سے دستبردار ہوئے۔

یہ شرائط تحریر کی گئیں، ان پر گواہ بنائے گئے لیکن امیر شام نے ان شرائط کو پس پشت ڈال دیا اور ملوکیت کی داغ بیل ڈال دی۔ شرائط کو تسلیم نہ کر کے اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یزید کو اپنا جانشین بنا دیا۔

۹۔ واں دگر مولائے ابرار جہاں
قوت بازوئے احرار جہاں

اس شعر میں حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے دوسرے بیٹے یعنی امام حسین علیہ السلام کا تعارف ہے کہ جو دنیا کے نیکوکار لوگوں کے سردار ہیں اور دنیا میں جہاں جہاں حریت وآزادی کے متوالے رہتے ہیں ان کے قوت بازو ہیں۔

۱۰۔ در نوائے زندگی سوز از حسین
اہل حق حریت آموز از حسین

زندگی کی نوا میں سوز حسین کی ذات سے ہے۔ اہل حق نے حریت وآزادی کا درس امام

حسین علیہ السلام سے ہی سیکھا ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے ہمیں عزت سے جینا سکھایا۔امام حسین علیہ السلام نے ذاتی اور شخصی غلامی سے انسانوں کو نجات دلائی۔صحیح معنی میں جینے کا سلیقہ اور زندگی کا قرینہ سکھایا اور دنیا میں ہر طرف حق وصداقت کی جو آوازیں بلند ہورہی ہیں وہ امام حسینؑ کی ذاتِ گرامی کا تصدق ہے۔

۱۱۔ سیرتِ فرزندہا از اُمہات

جوہرِ صدق وصفا از اُمہات

اولاد کی سیرت کو سنوارنے اور کردار کو بہتر بنانے میں ماؤں کا بہت بڑا ہاتھ اور حصہ ہے۔اولاد میں جو خوبی اور جوہر ہوتا ہے وہ ماں کی پرورش کا نتیجہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اس شعر میں عورت کے تیسرے کردار پر گفتگو کررہے ہیں اور وہ ماں کا کردار ہے۔ماں کو عربی میں ام کہا جاتا ہے اور اُمہات اس کی جمع ہے۔اُم کے معنی ہیں اصل، حقیقت، ماہیت اُم الکتاب سورہ فاتحہ کو اور اُم القریٰ، مکہ مکرمہ کو اور اُم الراس، دماغ کو کہتے ہیں۔

علامہ اقبال اس شعر کے ذریعے فکروں کو جلب کررہے ہیں اور دعوتِ فکر دے رہے ہیں کہ غور سے کردار امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا مشاہدہ کرو۔ان دونوں شاہزادوں کی تربیت میں ماں کا دخل ہے جو وہ اس درجے پر فائز ہیں جہاں طائرِ وہم وخیال بھی پرواز نہیں کرسکتا۔

۱۲۔ مزرعِ تسلیم را حاصل بتول

مادراں را اُسوۂ کامل بتول

تسلیم ورضا کی کھیتی کا حاصل بتولؑ ہیں اور ماؤں کے لیے مکمل نمونۂ عمل بتولؑ کی ہستی ہے۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کا ذکر بتول کے نام سے کیا ہے۔کائنات شرف میں صرف دو بتول ہیں۔ایک حضرت مریمؑ کا نام بتول تھا، دوسرے حضرت فاطمہ زہرا بتول ہیں۔

حضرت مریم کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۝ (سورۃ آل عمران ۳: ۴۲)

اے مریم! اللہ نے تم کو منتخب کر لیا ہے، پاک و پاکیزہ رکھا ہے اور عالمین کی عورتوں پر تمھیں منتخب کر لیا ہے۔

اور حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے لیے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۝

(سورۃ الاحزاب ۳۳: ۳۳)

اے اہل بیت! اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ آپ سے ہر طرح کے رجس کو دور رکھے اور آپ سب کو پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔

ابن منظور اپنی کتاب ''لسان العرب'' میں ''بتل'' کے مادے کے ذیل میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔ احمد بن یحییٰ سے حضرت فاطمہ بنت سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ بتول اس لیے ہیں کہ حضرت فاطمہ اپنے زمانے کی عورتوں سے اور اُمت کی خواتین سے عفت، فضل، دین اور حسب نسب کے لحاظ سے علیحدہ اور جدا ہیں۔

اس نظم سے اقبال کا مقصد یہ ہے کہ دنیا جہان میں ہر عورت کو چاہیے کہ وہ جناب سیدہ کے اسوۂ حسنہ کو اپنائے۔ ان کی حیاتِ طیبہ کو اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل بنائے اس لیے کہ کائنات کی کوئی عورت بیٹی، بیوی اور ماں تینوں حیثیات سے مکمل نمونۂ عمل نہیں بن سکتی سوائے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے۔

۱۳۔ بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودے چادر خود را فروخت

ایک محتاج کی خاطر آپ کا دل اس قدر پریشان اور بے چین ہوا کہ آپ نے اپنی ردا

یہودی کو فروخت کر کے اس محتاج کی مدد کی۔

علامہ اقبال اس شعر میں جناب سیدہ انسیۃ الحوراء، بتول عذرا کے ایثار و سخاوت کی بات کر رہے ہیں جو کتابوں میں مذکور ہے جسے ہم قارئین کی دل چسپی کے لیے بیان کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ قبیلہ بنو سلیم کے ایک بہت بوڑھے آدمی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں دین کے ضروری احکام و مسائل بتائے اور پھر ان سے پوچھا۔ "کیا تمھارے پاس کچھ مال بھی ہے؟" انھوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! قسم ہے اللہ کی، بنو سلیم کے تین ہزار آدمیوں میں سب سے زیادہ غریب اور محتاج میں ہی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ تم میں سے کون اس مسکین کی مدد کرے گا۔ سید الخزرج حضرت سعد بن عبادہؓ اٹھے اور کہا۔ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو میں اس کو دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کون ہے جو اس کا سر ڈھانک دے۔ سیدنا حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام اٹھے اور اپنا عمامہ اتار کر نو مسلم اعرابی کے سر پر رکھ دیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کون ہے جو اس کی خوراک کا بندوبست کرے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے ان صاحب کو ساتھ لیا اور ان کی خوراک کا انتظام کرنے لگے۔ چند لوگوں سے دریافت کیا لیکن وہاں سے کچھ نہ ملا۔ آخر سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیدہ نے پوچھا کون ہے؟ حضرت سلمانؓ نے سارا واقعہ بیان کیا اور التجا کی۔ اے سچے رسول کی بیٹی! اس مسکین کی خوراک کا بندوبست کیجیے۔

سیدہ عالم نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ اے سلمان! خدا کی قسم آج سب کو تیسرا فاقہ ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہوئے ہیں لیکن سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دوں گی۔ جاؤ میری چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو فاطمہ بنتِ محمد کی یہ چادر رکھ لو اور اس کے عوض اس مسکین کو کچھ جنس دے دو۔

حضرت سلمانؓ اعرابی کو ساتھ لے کر شمعون کے پاس پہنچے اور اس سے تمام کیفیت بیان کی۔ وہ دریائے حیرت میں غرق ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی

ہیں جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ سیدہ عالم کے پاکیزہ کردار کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ بے اختیار پکار اٹھا۔

اے سلمان! خدا کی قسم یہ وہ لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی ہے۔ تم گواہ رہنا کہ میں فاطمہ کے باپ پر ایمان لایا۔

اس کے بعد کچھ غلہ حضرت سلمانؓ کو دیا اور چادر بھی سیدہ کو واپس بھجوادی۔ وہ سیدہ کے پاس واپس آئے تو سیدہ نے اپنے ہاتھ سے اناج پیسا اور جلدی سے اعرابی کے لیے روٹیاں پکا کر حضرت سلمانؓ کو دیں۔ انھوں نے کہا: اے میرے آقا کی لخت جگر! ان میں کچھ بچوں کے لیے رکھ لیجئے۔ سیدۃ النساء نے جواب دیا۔

سلمان! جو چیز میں راہ خدا میں دے چکی وہ میرے بچوں کے لیے جائز نہیں۔ حضرت سلمانؓ روٹیاں لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے وہ روٹیاں اعرابی کو دیں اور پھر حضرت فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کے سر پر اپنا دست شفقت پھیرا، آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کی: یا الٰہا فاطمہ تیری کنیز ہے اس سے راضی رہنا۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودی چادر خود را فروخت

سیرۃ خاتون جنت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مولفہ طالب الہاشمی ص 126-128۔

سیرۃ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا مولفہ خان بہادر مولوی سید اولاد حیدر فوق بلگرامی ص 361-362۔

۱۳۔ نوری وہم آتشی فرماں برش
گم رضایش در رضائے شوہرش

علامہ اقبال اس شعر میں فرماتے ہیں کہ پوری کائنات حضرت فاطمہ الزہرا کا حکم مانتا اور

اسے تسلیم کرنا اپنے لیے باعث شرف اور موجب عزت وتکریم گردانتی ہے۔ نوری مخلوق یعنی فرشتے اور آتشی مخلوق یعنی جنات بھی آپ کا حکم مانتے اور آپ کے ہی زیر فرمان ہیں۔

اگر ہم سیدہ کے کردار پر نظر کریں تو آپ کی مرضی شوہر کی مرضی میں گم ہے۔ یعنی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا اپنے شوہر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی تابع فرمان ہیں۔

جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ فرشتے حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے گھر پہ خادم بن کر آتے ہیں۔

میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گیہوں دے کر فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے پیس کر آٹا بنائیں۔ پھر جب میں دوبارہ گئی تو کیا دیکھا کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا محراب عبادت میں کھڑی ہیں اور چکی چل رہی ہے۔ میں نے اس بات کی اطلاع نبی اکرم ﷺ کو دی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ فاطمۃ الزہرا کی تھکاوٹ کو جانتا تھا لہٰذا اس نے چکی کی طرف وحی کی تو وہ چلنے لگی۔

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حضرت علی علیہ السلام کو بلانے کے لیے ان کے گھر بھیجا۔ میں ان کے گھر گیا۔ میں نے آواز دی، کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے نبی اکرم ﷺ کو اس بات سے مطلع کیا۔ انھوں نے مجھے دوبارہ بھیجا کہ جاؤ وہ گھر پر ہیں انھیں بلا کر لاؤ۔ اب جو میں آیا تو میں نے دیکھا کہ چکی چل رہی ہے اور کوئی اس کے پاس نہیں ہے۔ میں نے حضرت علی سے کہا۔ نبی اکرم (ﷺ) آپ کو بلاتے ہیں۔ میں نے نبی اکرم ﷺ کو وہ بتایا جو میں نے دیکھا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: **يَا اَبَاذَر! لَا تَعْجَبْ فَاِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحُوْنَ فِي الْاَرْضِ مُوَكَّلُوْنَ بِمَعُوْنَةِ آلِ مُحَمَّدٍ۔** اے ابوذر اس بات سے تعجب نہ کرو۔ اللہ کے فرشتے زمین میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور وہ آل محمد کی مدد ونصرت پر مامور ہیں۔ (بحار الانوار ج 43 ص 45)

بعض روایات میں ہے کہ فرشتے مامور تھے۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا جب آرام فرماتی تھیں تو وہ فرشتے ان کی جگہ تسبیح پڑھتے اور حسنین کے جھولے جھلاتے اور چکی پیستے تھے۔

سیرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا از مولانا عبدالمجید خادم ص 84 میں تحریر ہے۔

سیدہ دو عالم رضی اللہ عنہا کا دستور تھا کہ جب حضرت علی علیہ السلام گھر تشریف لاتے تو سلام اور مرحبا کہہ کر ان کا استقبال کرتیں، بیٹھی یا لیٹی ہوتیں تو احتراماً کھڑی ہو جاتیں۔ انھیں مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہتیں، انھیں بستر پر بٹھاتیں، انھیں پانی پلاتیں، کھانا کا وقت ہوتا تو کھانا پیش کرتیں۔ غرض ان کی طرف پوری توجہ دیتیں، ان کا بے حد احترام کرتیں۔ وہ جو بھی حکم دیتے اس کی تعمیل کرتیں اور حتی الامکان انھیں ناراض نہ ہونے دیتیں۔ اکثر فقر و فاقہ میں ہوتیں مگر سیدۃ النساء بھوکی پیاسی رہ کر بھی ان کی خدمت میں لگی رہتیں اور اس میں کسی قسم کی غفلت و کوتاہی برتنا گناہ خیال کرتیں۔ (ص 84) یہ ہے وہ اسوۂ حسنہ جس کی طرف مسلم عورتوں کو توجہ دینی چاہیے۔ شوہر کا حکم ماننا چاہیے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دینا چاہیے۔

۱۵۔ آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لب قرآں سرا

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جو صبر و رضا کی تربیت گاہ میں پلی اور پروان چڑھی تھیں، چکی چلاتی جاتی تھیں اور ان کے لب قرآن کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے وہ تکلیف برداشت کرتیں مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ علامہ اقبال اس شعر میں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے اخلاق و کردار پر گفتگو کر رہے ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؑ ام المومنین جو طاہرہ اور صابرہ تھیں جنھوں نے ملیکۃ العرب ہونے کے باوجود تین سال شعب ابو طالب میں نہایت تکلیف دہ اور صبر آزما زندگی گزاری تھی۔ اسی ماحول میں سیدۂ عالمیان نے پرورش پائی تھی۔ بچپن سے ہی آپ کو صبر اور رضا کی تعلیم دی گئی تھی۔ ابھی کم سن ہی تھیں کہ والدہ کی شفقت سے محروم ہو گئیں۔ والد نے نہایت ناز و نعم سے پالا اور پرورش کی اور پھر جب حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ بن کر آئیں تو اس گھر میں بھی انھیں فقر و فاقہ کا سامنا تھا اور وہ یہاں پر بھی پیکر صبر و رضا بن کر رہیں۔ گھر کے تمام کام خود انجام دیتیں اور جو پیس کر روٹیاں پکاتی تھیں۔ جب چکی چلاتی تھیں تو ہاتھوں میں گٹے پڑ جاتے تھے مگر کبھی بھی اس امر کی شکایت نہ کرتیں اور ایسے

عالم میں ان کا محبوب مشغلہ قرآن کریم کی تلاوت کرنا تھا۔ قرآن مجید کا اس گھر میں ایسا چلن تھا کہ اس گھر کی کنیز فضہ کے حالات میں ملتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری بیس سالوں میں سوائے آیاتِ قرآنی کے کوئی اور حرف زبان سے نہیں نکالا۔ ان کی ہر گفتگو آیات قرآنی پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔

۱۶۔ گریہ ہائے او زبالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامانِ نماز

خواتین عام طور سے مصیبتوں سے تنگ آکر اور پریشانیوں سے گھبرا کر تکیے سے منہ چھپا کر گریہ وزاری کیا کرتی ہیں تاکہ کسی کو ان کے رونے کا علم نہ ہو۔ علامہ اقبال جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے لیے اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا گریہ و بکا اور نالہ وزاری تکیے سے بے نیاز تھا بلکہ وہ خوفِ خدا اور خشیتِ الٰہی کے سبب گریہ کناں ہوتی تھیں اور جب عبادت کے لیے مُصلّے پر تشریف لاتی تھیں تو شوقِ ملاقات اور ذوقِ عبادت میں ان کی آنکھوں سے بے اختیار اشک رواں ہو جاتے تھے۔ یہی آنسو ربِ جلیل کے حضور گراں بہا موتی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی یہ آنسو نہایت قیمتی اور گراں بہا ہوتے ہیں۔

۱۷۔ اشکِ او برچید جبریل از زمیں
ہمچو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

علامہ اقبال فرماتے ہیں اور یہ شعر سابقہ شعر سے متصل ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی آنکھوں سے جو اشک رواں ہوتے تھے انھیں جبرئیل امین سید الملائکہ نے زمین سے چن لیتے اور شبنم کے موتیوں کی طرح عرش پر پھیلا دیتے۔ علامہ اقبال نے تمثیلی انداز میں ان کے آنسوؤں کو شبنم سے تعبیر کیا ہے۔

۱۸۔ رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰ است

اللہ تعالیٰ کے آئین، دستور و قانون کی بیڑیاں میرے پیروں میں پڑی ہیں۔

اور حضور سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ کے حکم کا پاس اور لحاظ میرے آڑے آرہا ہے۔ یعنی میں شریعت کی پابندی کے سبب مجبور ہوں۔

ورنہ گرد تربتش گردید ے
سجدہ ہا برخاک او پاشید ے

ورنہ میں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی تربتِ اقدس اور قبرِ مطہر کے گرد طواف کرتا اور اسی خاک پاک پر اپنے سجدے نچھاور کر دیتا۔ یہ نہایت نادر خیال ہے جسے علامہ اقبال نے نظم کیا ہے۔ کسی اور شاعر نے اس جانب توجہ مبذول نہیں کی۔

اس شعر میں علامہ اقبال نے اپنے جذبات کا نہایت حسین اور خوب صورت انداز میں اظہار کیا ہے وہ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ زہرا سلام اللہ علیہا سے اپنی عقیدت اور عقیدے کو ظاہر کر رہے ہیں اور ایک انوکھا اور اچھوتا خیال پیش کر رہے ہیں۔

☆☆☆

اگر پندی ز درویشی پذیری
ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولی باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیری بگیری

(ارمغان حجاز ۳۶۹)

اگر تم کسی درویش سے اس نصیحت کو قبول کرو تو ہزاروں اُمتیں مرجائیں گی۔ فنا کے گھاٹ اتر جائیں گی۔ صفحۂ ہستی سے اُن کا نام و نشان مٹ جائے گا لیکن تم زندہ و پائندہ باقی اور جاوداں رہو گے۔ موت بھی تمہیں فنا نہ کر سکے گی۔ تم مرنے کے بعد بھی زندہ رہو گے۔ تم حضرت بتول سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا کے اسوۂ حسنہ کو اپناتے ہوئے ان کی حیات طیبہ و مبارکہ کو مشعل راہ بناتے ہوئے زمانے کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاؤ، زمانے سے اوجھل ہو جاؤ، اس زمانے کے نقش قدم پر نہ چلو، اس کے نشانِ راہ کو نہ اپناؤ، اگر تم ایسا کرو گے تو پھر

تمہاری آغوش میں شبیر صفت بچے آجائے گا۔ یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام جیسی جرأت، ہمت، شجاعت اور بسالت اس کو مل جائے گی جو زمانے سے ٹکرلے گا، زمانے کو اپنا مطیع و منقاد بنائے گا اور زمانے کی رو میں بہنے کی بجائے زمانے کو اپنا زیر نگیں بنالے گا اور یہی اس کی حیات کا باعث بن جائے گا۔

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اُسوۂ زہرا مبند
تا حسینے شاخِ تو بر آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد

(اسرار و رموز بے خودی ۱۸۰)

یہ اشعار اسرار و رموز بے خودی سے ماخوذ ہیں۔
نظم کا عنوان ہے:

"خطاب بہ مخدراتِ اسلام"
(اسلام کی خواتین سے خطاب)

اے مسلمان! تیری فطرت بلند و بالا جذبات رکھتی ہے۔ تجھ پر لازم ہے، تجھے چاہیے کہ تو حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے اُسوۂ حسنہ سے اپنی آنکھیں بند نہ کرے، ان کی زندگی کے نقوش، ان کی حیات طیبہ کے خطوط خواتین عالم کے لیے نمونہ عمل ہیں۔ وہ خواتین کے لیے مکمل نمونہ عمل ہیں۔ بحیثیت دختر، بحیثیت زوجہ اور بحیثیت ماں ان کا کردار مثالی ہے۔ اگر تو نے ان حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی زندگی کو نمونہ عمل بنایا اور اسے نظر انداز نہ کیا تو تیری شاخ سے جو پھول کھلے گا اس کا نام حسین ہوگا یعنی حسینی کردار کا حامل فرد ہوگا اور یہ موسم مستقبل میں تجھے گلزار کی خوش خبری دے گا۔

☆☆☆

امامت کا تصور اور اقبال

علامہ اقبال نے امامت کا نہایت وسیع اور عمیق تصور پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک امامت ایسا منصب ہے جو پوری قوم کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور باعثِ نجات ہے۔ امامت درحقیقت اُمت کی قیادت کا نام ہے اور آج کے دور میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی کا سبب اچھی قیادت کا فقدان ہے۔ ہر فرد قیادت کی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتا۔

علامہ اقبال "ضرب کلیم" ص 37 پر فرماتے ہیں۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ان کے نزدیک قوم اور اس کی امامت و قیادت کو سمجھنا اور جاننا ان مولویوں کے بس میں نہیں ہے جو مسجد میں پیش نماز بن گئے ہیں اور دو رکعت نماز پڑھانے میں مصروف ہیں۔ امامت کی حقیقت اور ماہیت ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ان کا علم محدود ہے، ان میں صلاحیتوں کا فقدان ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ قومیں کیا ہوتی ہیں اور ان کی قیادت اور زعامت کس طرح کی جاتی ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال اس منصب کے لیے تین شرطیں عائد کرتے ہیں۔

"بانگِ درا" ص 284 پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "طلوعِ اسلام" اس میں ایک شعر ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

شاعرِ مشرق کے نزدیک دنیا کی امامت صرف وہی کر سکتا ہے جس میں یہ تین شرطیں پائی جاتی ہوں۔

(1) صداقت۔ (2) عدالت۔ (3) شجاعت۔

جب ہم قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں منصب الٰہی کے لیے یہ نام ملتے ہیں۔

نبی، رسول، خلیفہ، وزیر، امام اور بادشاہ (ملکؑ)

اور ان سب کے پاس یہ تینوں صفتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ انھیں علم اور حکمت سے بھی نوازا گیا تھا۔

امامت ایک ایسا منصب خداوندی ہے جو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی، رسول، اولو العزم، صاحب شریعت، صاحب صحیفہ اور خلیل بنانے کے بعد ایک اہم منصب اور عطا کیا جس کا نام امامت تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ (سورۂ البقرہ۲: ۱۲۴)

اور وہ وقت یاد کرو جب ابراہیم کے رب نے چند کلمات کے ذریعے ان کی آزمائش کی۔ وہ ان سب میں پورے اتر گئے تو اللہ نے کہا۔ اے ابراہیم! میں تمھیں تمام انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیمؑ نے عرض کی۔ اور میری ذریت میں سے؟ تو اللہ نے فرمایا میرا یہ عہد (امامت) ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

مسلمانوں کا ایک گروہ "امامیہ" ہے جو بارہ اماموں کی امامت کا قائل ہے۔ جس میں پہلے امام حضرت علی علیہ السلام ہیں اور آخری امام محمد مہدی آخر الزمان ہیں۔

مسلمانوں کے تمام فرقے، گروہ اور طبقات امام مہدی کی تشریف آوری پر متفق ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آخری دور میں ایک امام دنیا میں تشریف لائیں گے جو دنیا کو عدل و داد سے اسی طرح بھر دیں گے جیسی وہ ظلم و فجور سے بھر چکی ہوگی۔

امام بخاریؒ نے صحیح بخاری شریف میں ایک روایت نقل کی ہے:

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیف انتم اذا نزل ابن مریم

فیکم وامامکم منکم تابعہ عقیل والاوزاعی۔

(الجامع البخاری باب نزول عیسیٰ بن مریم حدیث 3449)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اس وقت تمھاری کیا حالت ہوگی جب فرزند مریم تمھارے درمیان آسمان سے نازل ہوں گے اور تمھارے امام تم میں سے ہوں گے۔ امام مہدی کے بارے میں اقبال نے بہت کچھ کہا ہے۔ "ضرب کلیم" ص 74 پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "مہدی" اس میں چار شعر ہیں۔

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغ چمن کو
مجذوب فرنگی نے بہ انداز فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو
ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردک ناداں کے کفن کو

"ضرب کلیم" ص 57 پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "مہدی برحق" اس نظم میں بھی چار شعر ہیں۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں
نے جدت گفتار ہے نے جدت کردار
ہیں اہل سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاس تخیل میں گرفتار

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

علامہ اقبال امام زمانہ جو امام منتظر ہیں ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آج کے دور میں اس مہدی برحق کی ضرورت ہے جو آئے اور آکر لوگوں کو نجات دلائے، بھنور سے نکالے، ان کی مشکلات کو دور کرے، جس کی نگاہ عالم افکار میں ایک زلزلہ برپا کردے۔

علامہ اقبال امام مہدی کے بارے میں "بال جبریل" ص 90 پر فرماتے ہیں۔

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی
گیا دور حدیث لن ترانی
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی

علامہ اقبال کے ان اشعار سے پتا چلتا ہے کہ اس قوم کو مہدی برحق کی ضرورت ہے جو عالم کے، کائنات کے افکار کو یکسر تبدیل کر کے نیا نظام قائم کرے جو مبنی برعدل اور مبنی برصدق ہو۔ جو دنیا سے ظلم و جور کو مٹائے، عدل و انصاف کا بول بالا ہو اور ظلم وستم کا خاتمہ ہوجائے۔ احادیث نبویہ سے ایک امام آخر الزمان کا آنا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کا آسمان چہارم سے تشریف لاکر اس امام کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت ہے۔ قتادہ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا۔ میں نے سعید بن مسیّبؒ سے پوچھا۔

المھدی حق ھو؛ قال حق: قال: قلت ممن ھو قال من قریش قلت من ای قریش قال من بنی ھاشم قلت من ای بنی ھاشم؛ قال من بنی عبد المطلب قلت من ای عبد المطلب؛ قال من ولد فاطمۃ۔

کیا مہدی کا آنا برحق ہے؟ فرمایا ہاں برحق ہے۔ میں نے دریافت کیا ان کا کس خاندان سے تعلق ہے؟ فرمایا قریش سے، کہا کس قریش سے؟ فرمایا بنی ہاشم سے۔ میں نے کہا کس بنی ہاشم سے؟ فرمایا بنی عبد المطلب سے۔ کہا کس عبد المطلب سے؟ فرمایا فاطمہ کی اولاد سے۔

المهدى المنتظر فى ضوء الاحاديث والآثار الصحيحة تاليف الدكتور عبدالعليم عبدالعظيم البستوى المكتبة المكية دار ابن حزم مطبوعه 1999ء ص 240۔

عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

اَلْمَھْدِیُّ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْتِ یُصْلِحُہُ اللّٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ

مہدی ہم اہل بیت سے ہے ایک رات میں اللہ اس بات کو درست کرے گا۔

(الفتن والملاحم ۱/۳۱)

31/1 سنن ابن ماجہ (367/2) حدیث نمبر 4085

بحوالہ المہدی المنتظر ص 147

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی تَمْتَلِئَ الْاَرْضُ ظُلْمًا وَّعُدْوَانًا۔ قَالَ: ثُمَّ یَخْرُجُ رَجُلٌ مِنْ عِتْرَتِیْ اَوْ اَھْلِ بَیْتِیْ یَمْلَؤُھَا قِسْطًا وَّعَدْلًا کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَّعُدْوَانًا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک زمین ظلم اور دشمنی سے بھر نہ جائے۔ فرمایا پھر میری عترت یا اہل بیت میں سے ایک شخص نکل کر آئے گا جو اس زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم اور دشمنی سے بھری ہوگی۔ مسند امام احمد (36/3 مسند ابویعلی 61)

بحوالہ: المهدى المنتظر فى ضوء الاحاديث والآثار الصحيحة تاليف الدكتور عبدالعليم عبدالعظيم البستوى المكتبة المكيه دار ابن حزم ص 33۔

یہ کتاب مکمل امام مہدی پر تحریر کی گئی ہے۔ اس میں 432 صفحات ہیں اور یہ تحقیق کتاب سعودی عربیہ میں صحیح احادیث امام مہدی کے بارے میں لکھی گئی اور اس کتاب کی دوسری جلد میں احادیث ضعیفہ کا تذکرہ ہے۔

یادداشتیں

ادارہ نشر دانش، نیوجرسی، امریکا

IQBAL

Bārgāh-e-Iṣmat-o-Ṭahārat Mayn



Compiled and Explaind By

Syed Tilmiz Hasnain Rizvi